بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

جلد نمبر ۸۰ ماہ اپریل ۲۰۱۲ء مطابق جمادی الاول ۱۴۳۳ھ شمارہ نمبر ۴

مدیر
خلیل الرحمان سجاد نعمانی
E-mail : ilm.zikr@yahoo.com

اس شمارہ میں

	مضامین	مضامین نگار	صفحہ نمبر
۱	نگاہ اولیں	مدیر	۳
۲	محفل قرآن	مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی	۱۷
۳	حضرت مجدد الف ثانیؒ کا جہاد "تجدید"	حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ	۲۵
۴	معارف ومسائل	حضرت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی	۳۰
	تبلیغ کی عظیم محنت کو سمجھئے	مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی	۳۵
۵	اولاد کی ترقی کا خواب	مولانا ابوحسان پوحرک	۴۷

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ .V.P ارسال کیا جائے گا جس میں آپ کے -/35 روپے زائد خرچ ہوں گے — منیجر

ضروری اعلان

درج ذیل مقامات میں الفرقان کی توسیع اشاعت کی ذمہ داری جن حضرات نے قبول کی ہے ان کے نام اور فون نمبر نیچے لکھے جارہے ہیں۔ ان مقامات اور قرب وجوار کے حضرات اُن سے رابطہ قائم کریں۔

مقام	نام	فون نمبر
۱-اورنگ آباد	مولانا انیس الرحمٰن ندوی	(0)9423456752
۲-مالیگاؤں	مولانا حسنین محفوظ	(0)9226876589
۳-بیلگام	مولانا تنویر صاحب	(0)9880482120
۴-بڑودہ (گجرات)	مفتی محمد سلمان صاحب	(0)9898610513

مرتب: یحییٰ نعمانی

ناظم شعبۂ رابطہ عامہ : بلال سجاد نعمانی

E-mail: nomani_sajjadbilal@yahoo.com

☆ سالانہ چندہ برائے ہندوستان — عمومی 180 روپے

☆ سالانہ چندہ برائے ہندوستان — خصوصی خریداران 400 روپے

☆ سالانہ چندہ برائے ہندوستان (وی پی سادہ) 210 روپے

☆ سالانہ چندہ برائے پاکستان، پاکستان میں -/1200 ہندوستان میں -/750 روپے

☆ بیرونی ممالک بذریعہ ہوائی جہاز -/20 پاؤنڈ -/40 ڈالر خصوصی خریداران £30/-

لائف ممبر شپ فیس: ہندوستان -/5000 روپے، بیرونی ممالک 500 پاؤنڈ 1000 ڈالر

برطانیہ میں ترسیل زر کا پتہ: Mr. RAZIUR RAHMAN 90-B HANLEY ROAD, LONDON N4 3DW (U.K) ,Fax & Phone : 020 72721352

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: ادارہ اصلاح وتبلیغ، آسٹریلین بلڈنگ لاہور۔ (فون: 7663896 - 7655012)

ادارہ کا مضمون نگار کی فکر سے اتفاق ہونا ضروری نہیں۔

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ الفرقان 114/31 نظیر آباد، لکھنؤ - 226018

فون نمبر: 0522-4079758 e-mail : alfurqan_lko@yahoo.com

خلیل الرحمٰن سجاد کے لئے پرنٹر پبلشر محمد حسان نعمانی نے کاکوری آفسٹ پریس کچہری روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۱۳ رنیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

مولانا محمد عمرین محفوظ رحمانی ☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

[۲۴/فروری 2012 کی صبح فجر سے پہلے اڑیسہ سے ایک عزیز مولوی خیرالدین نے بذریعہ فون یہ اطلاع دی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے بمبئی میں حضرت مولانا قاری امیر حسن صاحب کا وصال ہوگیا —— یہ خبر سن کر کیا عرض کروں دل کی کیا کیفیت ہوگئی، احساسات وجذبات پر سکتہ سا طاری ہوگیا، یا اللہ اب کیا ہوگا، مادیت، خودغرضی، انانیت، اظہارِ ذات اور مال وجاہ پسندی بلکہ پرستی کے اِن گھٹاٹوپ اندھیروں میں خلوص وللّٰہیت، سادگی وتواضع اور عبدیت وفنائیت کی اعلیٰ انسانی قدروں کی روشنیاں اب کہاں سے ملیں گی؟؟؟ بے ساختہ وہی مصرع جو اس مضمون کا عنوان ہے، زبان پر جاری ہوگیا ع

ایک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے

یہ ناچیز راقم سطور جس زمانے میں بسلسلۂ تعلیم مدینہ منورہ میں مقیم تھا، (یعنی ۱۹۷۳ء تا ۱۹۸۲ء کا زمانہ) اس دور میں اکثر وبیشتر داعی الی اللہ حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب مہاجر مدنی کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت ملتی رہتی تھی، اور حضرت اپنے خطوط زیادہ تر اپنے اس خادم ہی سے املاء لکھوایا کرتے تھے، ان خطوط میں ایک خط ایسا ہوتا تھا جس کا اسلوب اور لب ولہجہ دوسرے خطوط سے کافی مختلف محسوس ہوتا تھا، ایسا لگتا تھا کہ خط لکھوانے والا اور مکتوب الیہ دونوں ایک دوسرے کے جگری دوست ہیں، وہی دوستانہ انداز اور عاشقانہ اسلوب، وہی گلے شکوے اور شعروشاعری، مجھے خوب یاد ہے کہ شروع شروع میں یہ جاننے کا شدید اشتیاق ہوتا تھا کہ آخر یہ صاحب ہیں کون؟ جن سے ہمارے حضرت کو ایسی شدید والہانہ محبت ہے کہ خط لکھواتے وقت ان کے چہرے کی بشاشت اور طبیعت کی شگفتگی دیدنی ہوتی تھی، —— بالآخر مجھ سے رہا نہ گیا، اور ایک دن پوچھ ہی بیٹھا کہ حضرت! یہ کون صاحب ہیں؟ بس کیا تھا مانو جیسے کسی نے حضرت کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا ہو، اور جیسے کسی نے مولانا کی عمر رفتہ کو

☆ خادم خانقاہ نقشبندیہ رحمانیہ، مالیگاؤں ضلع ناسک

آواز دے دی ہو —— مولانا نے کہنا شروع کیا:

ارے کیا بتائیں ہمارا یہ دوست کون ہے، یہ ہیں مولانا قاری امیر حسن صاحب جو ہر دوئی میں خاموش بیٹھے روشنی پھیلا رہے ہیں، ہم اور وہ مظاہر علوم سہارنپور میں ہم سبق اور ہم زمانہ بھی تھے، اور ہم نوالہ وہم پیالہ بھی۔ نوجوانی کے دنوں ہی سے وہ ولی نظر آتے تھے، قلت طعام اور قلت کلام اور قلت منام کے اصول پر شروع سے عمل پیرا، سراپا تقوی واحتیاط، قہقہہ لگا کر اس وقت بھی کبھی ہنستے ہوئے انھیں نہیں دیکھا گیا، سنجیدگی، تواضع اور حیا وحلم جیسی بہترین صفات کا ایک بہترین پیکر..... زندگی میں وہ میرے اکیلے دوست ہیں.....

میرے جیسے ایک مبتدی ''تبلیغی'' کے لئے یہ بہت چونکا دینے والی بات تھی کہ مدرسہ وخانقاہ کے اندر چھپی ہوئی یہ کونسی پوشیدہ شخصیت ہے جس کی اتنی قدر ''ہمارے حضرت'' کے دل میں ہے جو خود سرتا پا ''تبلیغی'' ہیں۔ بعد میں تو ہمیشہ دیکھنے میں آتا تھا کہ حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب جیسے ہی سفرِ ہند کے دوران مرکز نظام الدین پہنچتے تھے فوراً ہی حضرت مولانا قاری امیر حسن صاحب بھی وہاں پہنچ کر دو تین دِن حضرت مولانا کے ساتھ گذارتے تھے۔۔۔۔ اور پھر جیسے جیسے ہماری عمر آگے بڑھتی گئی اور تجربے ہوتے رہے، یہ بات کھلتی چلی گئی کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ''مقاصد'' پر نظر رکھتے ہیں، جوہرِ دین اور حقیقت دین کے قدردان ہیں، کس راستے سے گذر کر اور کس قسم کی محنتوں کے ذریعہ کسی کو وہ جوہر ملتا ہے، اس کی ان کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں ہوتی، اسی لئے ان کے دلوں میں وسعت ہوتی ہے اور وہ تنگ نظری اور عصبیت سے محفوظ ہوتے ہیں —— اور مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کے پھولوں کی یکساں قدر کر کے اپنی ذات کو ''گلدستہ'' بنانے میں لگے رہتے ہیں، جب کہ ان کے بہت سے نادان نام لیوا ایک دوسرے کی تنقیص وتذلیل میں لگے رہ کر خود اپنی ہی ہلاکت کا سامان کرتے رہتے ہیں۔

بہر حال جس خاموشی اور وضعداری کے ساتھ اس بندۂ خدا نے اپنی پوری زندگی خود ایک شیخ کامل ہوتے ہوئے ایک دوسرے عظیم بزرگ اور مربی حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ کے زیر سایہ، ان کے مدرسے میں خدمت کرتے ہوئے اس شان کے ساتھ گذار دی کہ ایک بار جب اس مدرسے میں خدمت کے لئے داخل ہوئے تو پھر ۶۵ سال کے بعد موت ہی ان کو وہاں سے جدا کر پائی، تنہا یہی بات ان کے اخلاص وفنائیت کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے —— خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حضرت مولانا قاری امیر حسن صاحب کو دیکھ کر شدت سے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ کاش وہ تمام لوگ جو مختلف وجہ سے تصوف اور اہل تصوف سے مناسبت نہیں رکھتے، اور کسی ایک آدھ مزاجی عدم مناسبت کی وجہ سے خیر کے ایک بہت اہم سرچشمے سے دور دور رہتے ہیں، کاش ایسے لوگ صرف ایک

مرتبہ اپنی عینک اتار کر اِس بندۂ خدا کے پاس آجائیں، اسے قریب سے دیکھ لیں، اور پھر بتائیں کہ کیا ایسے بے نفس، بھولے بھالے، مسکین طبع اور فقیر منش لوگوں سے محبت کرنا اور ان سے قریب رہ کر اپنی جھولی میں بھی کچھ بھیک ڈلوانے کی کوشش کرنا کوئی جرم ہے؟؟؟ اور کیا اسکی ان کو کوئی ضرورت نہیں ہے؟

ہائے افسوس کہ وہ چلے گئے، اور وہ کیا چلے گئے، تعلیم و تربیت اور مردم سازی کے اس طرز کا ایک کامل نمونہ چلا گیا جس کا شجرۂ نسب صفۂ نبوی سے ملتا ہے اور جس کی بچی کھچی روایات شاید مدرسہ اور خانقاہ ہی میں رہ گئی ہیں، بلا مبالغہ ان کو چند لمحے دیکھنے ہی سے احساس ہوتا تھا کہ اس بندۂ خدا کے وجود میں بہیمیت کا حصہ انتہائی مغلوب و مضمحل اور ملکیت و روحانیت کا جزو نہایت غالب و طاقتور ہے، اور یہی حاصل و مقصود ہے تمام عبادتوں اور ریاضتوں کا —— کاش کہ ہم ان باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے!!

مجھے اپنے قلم کو تھامنا چاہئے! جی تو چاہتا تھا کہ حضرتؒ پر تفصیل سے کچھ لکھوں، مگر یہ خیال رکاوٹ بھی بنتا تھا کہ نہ تو میں زیادہ واقف ہوں، اور نہ زندگی میں کچھ استفادہ ہی کر سکا،.... پس مجھے کیا حق ہے؟ اس لئے متردد تھا، اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی، اور عزیز مکرم مولانا محمد عمرین محفوظ رحمانی کا ایک مضمون آ گیا —— جو نہ صرف یہ کہ ہر دو ئی سے فیض یافتہ ہیں، حضرت سے براہ راست واقف بھی ہیں، اور علم و ذکر کا خاص ذوق بھی رکھتے ہیں، نیز جواں عمری ہی میں حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی مدظلہ سے اجازت و خلافت کی ذمّے داری بھی ان کے کندھوں پر آ گئی ہے اور جسے وہ ماشاء اللہ بخوبی نبھا رہے ہیں۔ زادہ اللہ! —— چنانچہ میں نے بہتر یہ سمجھا کہ ان کا یہ مضمون الفرقان کے ادارتی صفحات میں شائع ہو —— ایک مختصر تعارفی نوٹ لکھنے کی غرض سے قلم اٹھایا تھا مگر لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔۔۔ بہر حال اب آپ اصل مضمون کا مطالعہ کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ —— **مدیر**]

۲۵ر فروری سنیچر کے دن برادرم مفتی محمد حسنین محفوظ نعمانی مدظلہ کا فون آیا، سلام و دریافت خیریت کے بعد انہوں نے پوچھا: حضرت قاری امیر حسن صاحب کے بارے میں خبر ملی؟ یہ جملہ سنتے ہی دل دھڑک اٹھا، نفی میں جواب پا کر انہوں نے خبر وحشت اثر سنا ہی دی کہ جمعہ کے دن حضرت قاری صاحب کا بمبئی میں وصال ہو گیا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ بے ساختہ زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون نکلا، دل وفورِ غم سے لبریز ہو گیا، عشاء کے بعد ہفتہ واری درس قرآن تھا کسی طرح طبیعت کو آمادہ کر کے درس قرآن دینے گیا، درس قرآن کے بعد ان کے وصال کا اعلان کر کے ان کے لئے تمام شرکائے مجلس نے دعائے مغفرت و رفع

درجات کی۔لوٹ کر گھر آیا اور تنہائی ملی تو یادوں کا سفر شروع ہوگیا۔ان کا سراپا نگاہوں میں پھرنے لگا ان کی خصوصیات اور کمالات کے نقوش تازہ ہوتے رہے،آہ! کیسا بابرکت وجود ہمارے درمیان سے اٹھالیا گیا اور کیسی عظیم شخصیت داغ مفارقت دے گئی!!! جونہیں جانتے وہ تونہیں جانتے لیکن ہم جیسے جوان کی شخصیت سے واقفیت کا گمان رکھتے تھے دل کا یہ احساس ہے کہ انہوں نے بھی قاری صاحب کو پوری طرح نہ پہچانا،فنائیت وتواضع کی چادر نے انہیں ڈھانپ رکھا تھا اور اسی میں لپٹے ہوئے وہ رب کریم کی جوارِ رحمت میں حاضر ہوگئے۔**اللھم لاتحرمنا اجرہ ولا تفتننا بعدہ۔**

داغِ فرقتِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یادش بخیر!۱۹۹۷ء میں والد محترم مولانا محفوظ الرحمان قاسمیؒ (سابق شیخ الحدیث مدرسہ بیت العلوم،مالیگاؤں) کا سانحۂ ارتحال پیش آیا،اس وقت راقم الحروف مدرسہ بیت العلوم میں زیر تعلیم تھا۔حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب ہردوئیؒ کے خاص ایماء اور خالِ معظم مولانا محمد شعیب مظاہریؒ (مجاز صحبت حضرت شاہ صاحبؒ) کے اصرار پر مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی میں تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھانے کے لئے حاضر ہوا اور سال بھر وہاں کی مبارک اور نورانی فضا میں رہ کر قرآن مجید کے اکیس پارے حفظ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔یہیں حضرت قاری صاحبؒ کی زیارت کی،دبلا پتلا جسم،سفید نورانی لمبی داڑھی،بہت ہی سادہ لباس،کم گو،کم آمیز،نگاہ ہمیشہ نیچی،آواز بہت ہی نرم اور پیاری،باوجود اس کے کہ میں بہت کم عمر تھا اور ان کی عظمت اور قدر و قیمت سے نا آشنا لیکن انہیں بار بار دیکھنے اور دیکھتے رہنے کا جی چاہتا تھا۔میں درجۂ حفظ کا طالب علم تھا اور وہ درجہ عالمیت میں درس دیتے تھے،اس لئے بہت کم براہِ راست گفتگو کا موقع ملا لیکن بعد نماز عصر مدرسہ کے احاطے میں منعقد ہونے والی اصلاحی مجلس میں ان کی بیش قیمت گفتگو سننے کی سعادت بار بار حاصل ہوئی۔عام معمول یہ تھا کہ حضرت تھانویؒ کی کوئی کتاب اپنے دستِ مبارک میں رکھتے اس کا کچھ حصہ پڑھ کر سناتے،پھر تھوڑی سی تشریح فرماتے،کہیں عبارت مشکل ہوتی تو اسے آسان کر کے بیان فرماتے،اس دور کی جو مٹی مٹی یادیں حافظے کی امانت ہیں اسے زندگی کا سرمایہ سمجھتا ہوں،ان سے سنی ہوئی باتیں کل تک نصیحت تھیں آج وصیت ہیں،قابلِ قدر بھی،لائقِ عمل بھی!

حضرت قاری صاحبؒ نہ بے مثال خطیب تھے،نہ صاحبِ طرز انشاء پرداز و ادیب،نہ نامور مصنف و مولف تھے،نہ باکمال شاعر،وہ تو تواضع وعبدیت کا مجسم پیکر تھے اور عاجزی وفنائیت کی اعلیٰ مثال

۔استقامت ان کی زندگی کا سب سے نمایاں عنوان ہے اور دین کی خدمت ان کا سرمایۂ حیات۔ وہ محبت و معرفت ربانی کے ذوق چشیدہ اور خدا رسیدہ ایسے انسان تھے جن کے رگ و ریشے میں عشقِ خداوندی اسی طرح رچا بسا تھا جیسے شاخِ گل میں بادِ سحر گاہی کا نم۔ طالب علمی کے دور میں انہوں نے جس راہ کو اختیار کیا زندگی کے نشیب وفراز اور اتار چڑھاؤ میں وہ اسی پر جمے رہے، ڈٹے رہے اور ہر لمحہ منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے رہے۔ تا آنکہ فرشتۂ اجل نے آ کر کہہ دیا: يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔

بزرگوں کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے　　ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ہر باخدا انسان پر خدا کی کسی صفت کی تجلی ہوتی ہے، اشرف المدارس ہردوئی میں اپنے دور کے دو عظیم بزرگوں کو دیکھنے، سننے اور برتنے کا موقع ملا۔ ایک تو حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلیفہ محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ اور دوسرے ہمارے ممدوح قاری صاحبؒ۔ اول الذکر پر خدائے ذوالجلال کی صفاتِ جلالیہ کا پرتو صاف محسوس ہوتا، منکرات پر سخت نکیر، اتباع سنت پر پورا زور، بے اصولی سے نفرت، بے ضابطگی پر تنبیہ، ہر ایک چیز کے لئے ضابطے کی تعیین اور اس پر عمل کی سخت ہدایت یہ ساری وہ چیزیں تھیں جو تھوڑا سا وقت گزارنے والے کو بھی محسوس ہو جاتیں۔ ثانی الذکر (قاری صاحبؒ) صفات جمالیہ کے زیر سایہ، صفتِ رحمۃ للعالمینی کی چادر میں لپٹے ہوئے، آواز و انداز، تدریس و خطاب، اصلاح و تربیت ہر ایک چیز میں نرمی و مروت، وہ جو قرآن نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں زبان و دل کی نرمی کی بات کہی ہے (فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ۔ آل عمران، آیت ۱۵۹) اس کا بہت ہی پیارا نمونہ تھے قاری صاحبؒ۔ سال بھر کا عرصہ کچھ مختصر نہیں ہوتا اس پوری مدت میں کبھی ان کی بلند آواز سننے تک کا موقع نہیں ملا، نہ کبھی کسی کو ڈانٹا، نہ سزا دی، نہ سختی سے پیش آئے۔ ان کے یہاں ان سب کے اظہار کا ذریعہ تھا پیاری اور مسرور کن مسکراہٹ اور شفقت سے بھرپور نگاہِ دل نواز۔

نہ بادہ ہے نہ صراحی ہے نہ دورِ پیمانہ　　فقط نگاہ سے رنگین ہے بزمِ جانانہ

ان کے ان اوصاف کا اندازہ لگانے کے لئے ایک واقعہ سن لیجئے، مدرسہ اشرف المدارس میں جس عمارت میں درجۂ حفظ ہے اسی کی بالائی منزل میں درجہ عالمیت کے طلبہ پڑھتے ہیں، قاری صاحب روزانہ

پڑھانے کے لئے درجۂ حفظ کے سامنے سے گذرتے ہوئے اوپر تشریف لے جاتے اور واپسی میں بھی ان کا گذر درجۂ حفظ کے سامنے سے ہوتا۔ ایک دن پڑھا کر قاری صاحب زینے سے جو اترے اور سامنے نگاہ پڑی تو دیکھا کہ ایک طالب علم جسے کلاس کے دوران گفتگو کرنے کی سزا دی گئی ہے وہ درجہ حفظ کے سامنے کھلے صحن میں کان پکڑے ہوئے اور منہ میں اینٹ کا ایک ٹکڑا پکڑے ہوئے کھڑا ہے (یہ سزا دراصل حضرت شاہ ابرارالحق صاحبؒ کی مقرر کردہ تھی کہ درجہ میں گفتگو کرنے والے طلبہ کو صحن میں کان پکڑوا کر اور صاف ستھرا دھلا دھلایا اینٹ کا ٹکڑا منہ میں رکھوا کر تھوڑی دیر کے لئے کھڑا کروا دیتے۔ یہ سزا اب بھی اشرف المدارس میں جاری ہے اور تازہ واردان بساطِ علم اس سے گزر کر سزا بھی پاتے ہیں اور لطف بھی اٹھاتے ہیں، منہ میں پکڑائے جانے والے اس اینٹ کے ٹکڑے کو شاہ صاحبؒ دواء اللغو فرمایا کرتے تھے۔) قاری صاحب مرحوم نے جو یہ دیکھا تو گویا تڑپ گئے فوراً طالب علم کے پاس تشریف لائے سلام کیا، دستِ شفقت سر پر پھیرا اینٹ کا ٹکڑا اپنے ہاتھ سے منہ سے نکالا اور نگاہ بھر کر طالب علم کو دیکھا، ہلکا سا مسکرائے اور پھر اسے لئے ہوئے درجۂ حفظ کے استاد کے پاس گئے، استاذ دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے، بڑے ہی نرم اور محبت بھرے بلکہ عاجزی سے لبریز لہجے میں قاری صاحب نے استاذ سے سفارش کی ''انہیں درجے میں بٹھا لیجئے'' استاذ نے صرف یہ کہا کہ جو حضرت کا حکم ہو۔ پھر وہ اپنے معمول کے مطابق سر جھکائے، نگاہ نیچی کئے ہوئے ذکر و فکر میں مستغرق آگے بڑھ گئے اور۔۔۔۔۔۔۔ اب تو وہ اتنا آگے اور ایسی جگہ چلے گئے جہاں سے واپسی کا امکان ہی نہیں لیکن ان کی شفقت کی یاد دل میں لئے ہوئے وہ طالب علم ابھی اس جہانِ فانی میں زندہ ہے اور جگ بیتی کی شکل میں آپ بیتی سنا رہا ہے۔ چودہ سال گذر گئے لیکن راقم الحروف پر گذرا ہوا یہ واقعہ کل کا واقعہ معلوم ہوتا ہے اور ان کی وہ ایک نگاہ آج بھی یاد آتی ہے، کیسی شفقت تھی اس نگاہ میں، سرزنش اور تنبیہ کے شائبے تک سے پاک، محبت، خلوص اور اپنا پن لئے ہوئے۔

حضرت قاری صاحبؒ فیض یافتہ اور دست گرفتہ تھے حضرت قطب عالم شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ کے، ۱۳۵۵ھ میں بہار کے ضلع سیوان کے ایک دیہات سے آکر جب وہ ہندوستان کے عظیم دینی ادارے مدرسہ مظاہر العلوم میں بحیثیت طالبِ علم داخل ہوئے اسی وقت سے حضرت شیخ سے ان کا جو تعلق قائم ہوا تو حضرت کی زندگی کے آخر تک قائم رہا۔ شیخ و مرشد کی خصوصی توجہات اور مستجاب دعائیں انہیں نصیب ہوتی رہیں، حضرت شیخ کے یہاں قلت کلام اور ترکِ اختلاط پر بہت زور تھا، حضرت قاری صاحبؒ نے ان

دونوں باتوں پر جس طرح عمل کیا اور اسے نبھا کر دکھایا اسے ان کی سب سے بڑی کرامت کہا جا سکتا ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ کی ایک بڑی اہم خصوصیت اوقات کی حفاظت اور ہر قسم کے لایعنی سے احتیاط تھی، لایعنی گفتگو، لایعنی کام جیسے وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ بشری ضروریات پر بھی بہت تھوڑا وقت صرف فرماتے، چوبیس گھنٹے میں کھانے کے نام پر شاید صرف پندرہ منٹ صرف ہوتے ہوں گے، کھانا بھی بہت ہی مختصر ہوتا، **لقم تلقم ظهره** کا عملی نمونہ انہیں کے یہاں دیکھنے کو ملا، ایک مرتبہ قریب سے انہیں کھانا کھاتے ہوئے دیکھا، چونکہ یہ ناچیز راقم حضرت شاہ ابرار الحق صاحبؒ کے گھرانے سے بہت مانوس تھا اور خاندانی تعلقات اور کم عمری کی وجہ سے گھر کے اندر بھی آتا جاتا تھا ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب کے یہاں سے کھانا لے کر حضرت قاری صاحب کے یہاں پہنچانے گیا، کھانا کیا تھا ایک پیالے میں تھوڑی سی دال جس میں روٹی کو باریک کر کے بھگو دیا گیا تھا، حجرے میں اجازت لے کر داخل ہوا اب یاد نہیں کہ حضرت کس کام میں لگے ہوئے تھے اتنا یاد ہے کہ عرض کیا کہ حضرت کھانا کھا لیجئے میں باہر ٹھہرتا ہوں برتن واپس لے جاؤں گا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا ٹھہر جایئے اور فوراً پیالہ ہاتھ میں لے کر روٹی سمیت دال کو پی لیا اور پیالہ واپس کر دیا، اس کھانے میں بمشکل تین چار منٹ صرف ہوئے ہوں گے۔ اب سوچتا ہوں کہ اللہ کے بندے اپنی ضروریات پر کس طرح کم سے کم وقت خرچ کر کے زیادہ اوقات دینی خدمت اور یادِ الٰہی میں بسر کرتے ہیں۔ یہی جذبۂ بے تاب ہے جو روٹیوں کے بجائے ستو پھانکنے کی ترغیب دیتا ہے اور ہمہ وقت یادِ الٰہی میں مشغول رکھتا ہے۔

عیش کا نام لے نہ تو ہم سے ہم کو فرصت کہاں ترے غم سے
جب یہ عالم ترا نظر آیا اٹھ گیا دل تمام عالم سے

تصوف وسلوک کی بنیادی تعلیم عاجزی اور بے نفسی ہے جس کا خلاصہ حضرت تھانویؒ کے بقول یہ ہے کہ ہر مومن سے فی الحال اور ہر کافر سے فی المآل اپنے آپ کو کمتر سمجھے، معرفت نفس اور محبت الٰہی جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے انسان اپنے عیوب سے واقف اور دوسروں کے عیوب سے بے خبر ہوتا جاتا ہے۔ پھر زندگی میں یہ احساس تازہ ہو جاتا ہے کہ ''اپنی نگاہ میں کوئی برا نہ رہا''۔ سلوک کی راہ میں یہ مقام بہت دیر سے اور آخر میں آتا ہے۔ اسی لئے صوفیا نے یہ بھی کہا ہے آخر ما یخرج من قلوب الصدیقین حب الجاہ۔ (صدیقین کے دل میں سے بھی سب سے آخر میں شہرت کی محبت نکلتی ہے) جب تک نفسانیت کی کثافتیں انسان پر

چھائی رہتی ہیں، معرفت کی لطافتیں اس پر آشکارا نہیں ہوتیں اور جب عاجزی کا احساس اور بے نفسی کا جوہر پیدا ہوجاتا ہے تو قربِ خداوندی کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں اسی لئے کسی عارف نے کہا ہے۔ ''**لا طریق اقرب الی اللہ من العبودیۃ و لا حجاب اغلظ من الدعوی و لا ینفع مع الاعجاب و الکبر عمل و اجتھاد و لا یضر مع الذل و الافتقار بطالۃ یعنی بعد الفرائض**'' (بندگی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا سب سے قریبی راستہ ہے اور دعوے سے زیادہ بڑا اور دبیز کوئی حجاب نہیں، خود پسندی کے ساتھ محنت و کوشش بھی کچھ کام نہیں دیتی اور عاجزی و مسکنت کے ساتھ نوافل میں سستی بھی نقصان نہیں پہنچاتی) عاجزی اور بے نفسی کا یہ جوہر حضرت قاری صاحبؒ کو منجانب اللہ ودیعت کیا گیا تھا۔ انہیں دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے لئے زبانِ رسالت سے نکلی ہوئی وہ بات یاد آتی ہے کہ ''جو کسی مردہ انسان کو زمین پر چلتا پھرتا دیکھنا چاہتا ہو وہ ابوبکر صدیق کو دیکھ لے''۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کے حالات میں بھی خود ان کا بیان کیا ہوا یہ ملفوظ ملتا ہے کہ میں نے تیس سال مجاہدات میں گزارے تب کہیں جا کر فنائیت کا مقام حاصل ہوا۔ اور اب حال یہ ہے کہ جب لوگ آ کر مجھے سلام کرتے ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ میری لاش کو سلام کر رہے ہیں۔ تواضع و فنائیت کا اونچا مقام بتمام و کمال بہت کم انسانوں کو ملتا ہے۔ قاری صاحبؒ کی زندگی اس کے لئے بہترین مثال ہے۔ مدرسہ اشرف المدارس میں انہوں نے تقریباً ستر سال درس و تدریس اور رشد و ہدایت میں گزارے۔ اس طویل ترین مدت میں وہ اپنی شخصیت کو نمایاں اور مشہور کرنے کی بھرپور کوشش کر سکتے تھے لیکن ان کے پیشِ نظر تو رضائے حبیب تھی جس کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو مٹایا اور اس طرح مٹایا کہ ان کی عاجزی و بے نفسی نے ان پر گمنامی کے پردے ڈال دئے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی ان کے گزر جانے کو اس طرح نہیں محسوس کیا جا رہا ہے جس طرح محسوس کیا جانا چاہئے تھا۔ شیخ عبدالحفیظ مکی (خلیفہ حضرت شیخ) کی مشہور کتاب ''موقف ائمۃ الحرکۃ السلفیۃ من التصوف والصوفیۃ'' میں کسی عارف کے حوالے سے یہ حکایت درج ہے کہ ''**دخلت علی اللہ من ابواب الطاعات کلھا فما دخلت من باب الا رأیت علیہ الزحام فلم اتمکن من الدخول حتی جئت باب التذلل و الافتقار فاذا ھو اقرب باب الیہ و اوسعہ و لا مزاحم فیہ و لا معوق فما ھو الا ان وضعت قدمی فی عتبتہ فاذا ھو سبحانہ قد اخذ بیدی و ادخلنی علیہ**'' (میں نے تمام طاعتوں کے ذریعے خدا تعالیٰ تک پہونچنے کی کوشش کی ہر دروازے پر میں نے بڑی بھیڑ پائی سوائے عاجزی اور فقر کے دروازے کے، جب میں اس دروازے پر حاضر ہوا تو میں نے اسے سب سے

زیادہ کشادہ اور سب سے قریبی دروازہ پایا جہاں نہ کوئی مزاحمت کرنے والا تھا اور نہ رکاوٹ پیدا کرنے والا میں نے جیسے ہی وہاں قدم رکھا تو اللہ پاک کی رحمت نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا) یہ حکایت جہاں ان بزرگ کی زندگی اور احوالِ زندگی کو بیان کرنے والی ہے وہیں حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی کا بہترین نقشہ بھی ہے، قاری صاحبؒ کی زندگی سے معمولی واقفیت رکھنے والا انسان بھی جب اس حکایت کو پڑھے گا تو فوراً اس کی نگاہ کے سامنے قاری صاحب کی دلنواز اور بے نفس شخصیت ابھر آئے گی۔

حضرت قاری صاحبؒ پچھلی صدی کی تیسری دہائی میں بہار کے ضلع سیوان کے ایک ایسے دیہات میں پیدا ہوئے جہاں بدعات وخرافات کا غلبہ تھا۔ پیدائش کا سال خود آپ کو بھی یقینی طور پر معلوم نہ تھا، البتہ آپ کے پاسپورٹ پر سن پیدائش ۱۹۲۶ء درج ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں اور گاؤں سے قریب ایک بستی میں حاصل کی، پھر جون پور کے مدرسہ کرامتیہ میں داخلہ لے کر فارسی اور ابتدائی عربی کا درس لیا۔ وہاں سے ۱۳۵۵ھ میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور تشریف لائے، جہاں سات سال تک زیر تعلیم رہ کر سندِ فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد ۱۳۶۳ھ میں عظیم عالمِ دین اور مشہور ترین بزرگ حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے مشورے سے مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ جس کا سلسلہ تادمِ آخر جاری رہا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل مدینہ منورہ کے کچھ معتقدین نے یہ پیش کش کی کہ آپ مدینہ منورہ میں قیام فرما ہو کر اپنے انفاسِ قدسیہ سے لوگوں کو مستفید فرمائیں لیکن آپ نے صرف اس وجہ سے قبول نہ فرمایا کہ یہ مدرسے والوں کے ساتھ بے وفائی ہوگی۔

زمانہ طالب علمی ہی میں آپ قطب زماں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے اور ذکر کی تعلیم لی۔ حضرت رائے پوری کے وصال کے بعد اپنے مشفق استاذ اور پچھلی صدی کی عظیم ترین شخصیت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ سے تجدید بیعت کی درخواست کی لیکن حضرت شیخ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ: ''میں حضرت مدنی اور حضرت رائے پوری سے جو لوگ بیعت ہوں انہیں دوبارہ بیعت نہیں کرتا ہوں البتہ خدمت کے لئے حاضر ہوں اور جو معمولات حضرت رائے پوری نے بتلائے تھے کرتے رہو۔'' چنانچہ آپ نے حضرت شیخ سے اصلاحی مراسلت اور رابطہ قائم رکھا۔ حضرت شیخ کی خصوصی توجہات آپ پر تھیں اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت قاری صاحبؒ اپنے مرشد کی خدمت میں کچھ عرصہ گذار کر ہردوئی واپس ہو رہے تھے تو حضرت شیخ نے واپسی کے وقت بہت گہری نظر سے آپ کو

دیکھا جس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت قاری صاحب کے قلب پر حضرت شیخ کی اس نظر کے دو نشانات عرصے تک معلوم ہوتے رہے اور ان نشانات میں روشنی اور نور بھی محسوس ہوتا رہا۔ اصلاح و تربیت کے مرحلوں سے گذرنے کے بعد ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ میں جمعہ کے دن حضرت شیخ نے آپ کو اجازت وخلافت سے نوازا جس کا واقعہ بڑا عجیب وغریب ہے اس لئے خود حضرت قاری صاحبؒ کے سادہ اور دلنشیں الفاظ میں نقل کر رہا ہوں۔ ''اجازت دینے سے قبل اس ناکارہ نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا کہ حضرت مرشدنا قدس سرہ مدینہ پاک سے جس تاریخ کو سہانپور آرہے تھے اسی تاریخ میں اخیر شب میں دیکھا کہ حضرت میرے کمرے میں آئے اس وقت میں ہردوئی میں تھا حضرت کے آنے کا علم تاریخ وغیرہ کا نہ تھا بعد میں حساب لگایا تو معلوم ہوا وہی تاریخ تھی، غرض حضرتؒ آئے اور ایک خوبصورت ڈبیہ جیسے روشنائی کی ڈبیہ ہوتی ہے لاکر مجھے دی اور فرمایا: ''تمہارے لئے لایا ہوں'' خواب ہی میں فرطِ مسرت کی وجہ سے آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے کہ حضرت کی کتنی بڑی شفقت ہے کہ ہزاروں انسان حضرت کے چاہنے والے ہیں ان کے لئے نہیں لائے اور مجھ ناکارہ کے لئے جو کسی لائق نہیں ہے لائے، حضرت کی کتنی بڑی مہربانی ہے۔

غرض خواب سے بیدار ہوا تو دل میں خوشی معلوم ہوئی۔ اب خواب لکھ کر حضرت کے یہاں ڈاک سے روانہ کیا۔ حضرت نے جواب مرحمت فرمایا کہ: ''پیارو! مادی چیزیں تو نہ اپنے لئے لایا نہ دوسروں کے لئے۔ باقی دعا سے کسی کے لئے غافل نہیں رہا، باقی تمہارا خواب مبارک ہے جب آؤ پرچہ ساتھ لیتے آؤ۔'' ہاں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ حضرت کو جب دیکھا تو اس قدر خوبصورت ہیں کہ چاند کا ٹکڑا ہے۔

حتی کہ حیرت انگیز واقعہ پیش آیا یعنی مورخہ ۲۸ رمضان بروز جمعہ قبل اذان عصر ۱۳۸۵ھ احقر سراپا تقصیر کو مرشدی ومولائی حضرت اقدس نے اپنے معتکف میں طلب فرمایا بذریعہ بھائی ابوالحسن صاحب، احقر حاضر خدمت ہوا تو ارشاد ہوا کہ:

''یہ جبہ پہن لو'' (جو حضرت کا مستعملہ تھا خوشبو بے انتہا تھی کئی ماہ رہی) چنانچہ حسب ارشاد پہن لیا، پھر ارشاد فرمایا کہ: ''آج سے تمہیں اجازت دیتا ہوں بیعت کی۔ یہ امانت ہے حفاظت کرنا۔'' اس معاملہ سے ناکارہ کو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی حتی کہ سکتہ میں آگیا اور شام تک مبہوت سا رہا حتی کہ بخار کی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ سب کچھ حق تعالی نے اپنے لطف وکرم سے حضرت شیخ ؒ کے قلب میں ڈالا اس لئے یہ صورت ظاہر ہوئی۔ وہ جبہ گاہے اخیر شب میں حصول برکت کی نیت سے پہن لیتا ہوں اور بطور تبرک محفوظ

رکھتا ہوں۔''

اجازت وخلافت کے بعد آپ بہت ہی خاموشی کے ساتھ مسترشدین وسالکین کی خدمت میں مشغول رہے اور زندگی کی آخری دہائی میں آپ کی طرف رجوعِ عام ہوا اور بڑے بڑے علماء اور دین کے عظیم خادم آپ کے حلقہ بگوش ہوئے ،سالکین ومریدین کی خدمت کا یہ سلسلہ زندگی کے آخری دن تک جاری رہا۔

حضرت قاری صاحب نے جیسی مبارک ، پاکیزہ اور قابل رشک زندگی گزاری اللہ نے ویسی ہی اچھی موت انہیں نصیب فرمائی جمعہ کی مبارک رات ،تہجد کا وقت ،نماز سے فراغت پاکر باوضو گویا کہ سید الاولیاء کو سیدالایام میں لقاءِ حبیب کا پروانہ عطا کیا گیا اور اس عطا کے لئے خاص اس وقت کا انتخاب کیا گیا جس میں روزانہ رب کریم سے راز ونیاز کی سعادت جانے والے کو ملا کرتی تھی۔موت کا بہانہ سینے کا درد بنا جو ظاہری نگاہوں میں سینے کا درد تھا اور باطنی نگاہوں میں ایک عاشقِ صادق کے دل میں محبوبِ حقیقی سے ملنے کی کسک،جس نے قلب کی حرکت بند کردی اور محب کو محبوب اور مخلوق کو خالق تک پہنچادیا۔ ؎

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

برسوں پہلے حضرت قاری صاحب نے مدینہ منورہ میں اپنے مرشد گرامی حضرت شیخ الحدیثؒ کی خدمت میں ایک سال گزارا تھا۔جب سال بھر گزرنے کے بعد مرشد سے واپسی کی اجازت ملی تو روانگی کے وقت تنہائی میں قاری صاحب نے حضرت شیخ سے عرض کیا تھا حضور میرے لئے حسن خاتمہ کی دعا فرمادیجئے تو حضرت شیخ نے فرمایا تھا انشاء اللہ حسن خاتمہ بھی ہوگا ،دعا دینے والے اور دعا لینے والے دونوں جوارِ رحمت میں جا چکے لیکن دعا کی قبولیت کا مشاہدہ ہم جیسے عاجز وناکارہ انسانوں کے سامنے ہے۔حکیم مشرق اور صاحب دل شاعر اقبال کا کیسا غضب کا شعر یاد آ گیا۔

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیرِ عشق یافت مرگے کہ زاہداں بہ دعا آرزو کنند

حضرت قاری صاحب چلے گئے اور جانا کسے نہیں؟ لیکن جس شان سے وہ گئے ہیں وہ ہم جیسوں کے لئے اپنے اندر بڑا سبق رکھتی ہے اور اب جس طرح شانِ کریمی کی جانب سے ان کی ناز برداری ہورہی ہوگی اور ان پر رحمت ومغفرت کے پھول برسائے جارہے ہوں گے اور زندگی کے تھکے ہوئے مسافر کو جس طرح نعمتوں سے نوازا جارہا ہوگا اس کا تصور ہی بڑا پرکیف ہے اور عزیز ولذیذ بھی۔ان کی زندگی استقامت

کا اعلیٰ نمونہ تھی اور ان کی موت خدا تعالیٰ کے یہاں ان کے اونچے مقام کا اظہار و اعلان۔

ابر رحمت ان کے مرقد پر گہر باری کرے حشر تک شانِ کریمی ناز برداری کرے

☆☆☆

اس ماہ اپریل میں منعقد ہونے والا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا اجلاسِ ممبئی اور اس کی خصوصی اہمیت:

۲۰/۲۱/۲۲/اپریل ۲۰۱۱ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا اجلاس ممبئی میں منعقد ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں جب ممبئی کے تاریخ ساز کنونشن میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نام سے مسلمانانِ ہند نے تحفظ شریعت کے مقصد سے ایک ایسا پلیٹ فارم تشکیل دیا تھا جس میں تمام ہی مسلم جماعتوں، مسلکوں اور مکاتبِ فکر کی بھرپور نمائندگی تھی، اس وقت بھی ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء کو شدید خطرات لاحق ہو گئے تھے، اور ان ہی خطروں کے بروقت احساس نے بورڈ کی شکل میں ہندوستانی مسلمانوں کو بروقت ایک ایسی دفاعی لائن بنا لینے کا موقع فراہم کر دیا تھا، جسے اب تک بسیار کوشش کے باوجود ہندوستانی ریاست پار نہیں کر سکی ہے۔

اب تازہ صورت حال یہ ہے کہ قانون سازی کے ذریعہ مسلم پرسنل لاء کو کالعدم کرنے اور یونیفارم سول کوڈ کی تشکیل کی سرگرم کوشش کرنے کے بجائے عدلیہ کے ذریعہ عملاً مسلم پرسنل لاء کے خلاف فیصلے پر فیصلے صادر کرانے کی حکمت عملی اختیار کی جا رہی ہے، اور دوسری طرف اصل نشانہ مسلم پرسنل لاء کے بجائے مدارس و مکاتب کے اس نظام کو بنایا جا رہا ہے جو کچھ لوگوں کے خیال میں وہ مضبوط دفاعی لائن ہے جس کے سہارے بے شمار مشکلات کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے دین اور اپنی تہذیب کے تحفظ کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے —— پہلے مدرسہ بورڈ کے ذریعہ سے اس نظام میں مداخلت کر کے اس کو کمزور کر دینے کی کوشش کی گئی۔ جب سامنے سے کیا گیا یہ وار بھی علماء کی زبردست مخالفت کی وجہ سے خالی چلا گیا تو پشت کے پیچھے سے رات کے اندھیرے میں کئی اور حملے کئے گئے۔

اِن حملوں میں سب سے خطرناک حملہ اس قانون کے ذریعہ کیا گیا ہے جس کا نام ہے ''مفت اور لازمی تعلیم، بچوں کا بنیادی حق''

اس قانون کے خوبصورت نام سے اور تمہید سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت ہند اس قانون کے ذریعہ ہندوستان کے ہر بچے کو تعلیم یافتہ بنانا چاہتی ہے، گویا بچوں کو تعلیم دلانا اب ان کے والدین یا

سرپرستوں کا اختیاری معاملہ نہیں رہا، بلکہ ہر بچے کو حکومت اب قانون کے زور سے لازماً تعلیم دلائے گی اور وہ بھی بالکل مفت، سبحان اللہ! کتنا عمدہ قانون ہے؟؟ داد دینی چاہئے ان لوگوں کو جنھوں نے ایک ایسے زمانے میں جب کہ تعلیم صرف ایک انڈسٹری بن گئی ہے، اور متوسط اور غریب طبقے کے کروڑوں لوگوں کے لئے اپنے بچوں کو تعلیم دلانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے، اور ایک ایسے ملک میں جہاں کروڑوں لوگ نہایت کم عمری میں اپنے بچوں کو کھیتوں، کارخانوں، ہوٹلوں میں اور نہ جانے کہاں کہاں دو وقت کی روٹی کمانے میں لگا دیتے ہیں، اور اس طرح ان کا بچپن بھی چھین لیتے ہیں اور زندگی بھر ان کو جاہل و پسماندہ رکھنے کے جرم کے بھی مرتکب ہوتے ہیں، بالآخر ہمارے قانون سازوں نے اِن غریب گھرانوں کا بھی خیال کیا اور ان سب بچوں کو لازماً اور مفت تعلیم دلانے کی ذمہ داری حکومت نے اپنے اوپر لے لی!!! آفریں ہے اس حکومت کو اور اس کے فلاحی ارادوں کو۔

مگر ذرا ٹھیریئے! اس قانون کی دفعات کو پڑھ کر سمجھ میں آتا ہے کہ شاید یہ اس کا اصل ہدف نہیں ہے، اس قانون کے تفصیلی مطالعہ سے اس بابت کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ اس کا اصل نشانہ مدارس و مکاتب کا وہ نظام ہے جو اب تک ریاست کی ہزار کوششوں کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کو ہندو تہذیب میں ضم کر لینے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

اس قانون کی دفعات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی رو سے:

۱۔ تعلیم صرف وہ ہے جسے حکومت یا اس سے متعلق ادارے قانوناً تسلیم کریں۔

۲۔ تعلیم صرف وہ ہے جو کسی تسلیم شدہ اسکول میں کل وقتی طور پر داخلہ کے بعد حاصل کی جائے۔

۳۔ بچوں کے والدین اگر اپنے بچوں کو حکومت کے تسلیم شدہ ادارے میں داخل نہیں کریں گے تو وہ مجرم اور سزا کے مستحق ہوں گے۔

۴۔ جو اساتذہ بچوں کو کوئی اور تعلیم دیں گے وہ بھی مجرم ہوں گے۔

۵۔ جو شخص ایسا کوئی ادارہ قائم کرتا ہے جسے سرکاری منظوری حاصل نہیں ہے وہ بھی مجرم قرار دیا جائے گا۔

اب آپ خود سوچیں کہ کیا اس قانون کی زد براہ راست ہمارے مدارس و مکاتب کے نظام پر نہیں پڑے گی؟ کیا پہلے سے چلنے والے مدارس و مکاتب کے خلاف کسی بھی وقت قانونی کارروائی نہیں کی جاسکے گی؟ کیا کسی کے لئے اب ممکن رہے گا کہ اپنے بچوں کو وہ ابتدائی دینی تعلیم کے لئے کسی مدرسے یا مکتب میں بھیجے؟ یا اپنی قوم کے بچوں کے لئے کوئی نیا مدرسہ قائم کرے؟؟؟

مذکورہ بالا پہلوؤں کے علاوہ اور بھی کئی نکات اس قانون میں ایسے ہیں جن کی وجہ سے ملک اور ملت کے ہر بہی خواہ کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس قانون میں بنیادی اور اصولی تبدیلیوں کے لئے اپنی آواز بلند کرے۔

اس طرح انکم ٹیکس کے موجودہ قانون میں بنیادی تبدیلیاں کر کے جو نیا قانون بنایا جا رہا ہے اس کی رو سے اس بات کا شدید خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ اب مسجدوں اور دیگر عبادت گاہوں پر بھی ٹیکس لگایا جائے گا اور اس سے بچنے کی صرف ایک صورت ہوگی اور وہ یہ ہوگی کہ مسجدوں کے دروازوں کو تمام مذاہب کے ماننے والوں کو عبادتی رسوم ادا کرنے کے لئے کھول دیا جائے۔

اسی طرح اوقاف کے سلسلہ میں جو نیا قانون بن رہا ہے، اس کے نتیجے میں بہت بڑی تعداد میں اوقاف کے تحفظ کے لئے قانونی طور پر کوئی کوشش نہیں کی جا سکے گی۔

الغرض صاف ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ملی وجود اور اسلامی تشخص پر کئی طرف سے تازہ یورش اور نت نئے حملے کئے جا رہے ہیں۔

یہ ہے وہ صورت حال جس کو پیش نظر رکھ کر ایک طرف تو مسلم پرسنل لاء بورڈ نے، عظیم قائد کے عظیم فرزند حضرت مولانا سید ولی رحمانی کی قیادت میں ''آئینی حقوق بچاؤ تحریک'' کے نام سے ایک ملک گیر مہم چھیڑ دی ہے، اور دوسری طرف بمبئی میں اسی ماہ اپریل میں ایک عظیم اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

شاید بورڈ کے قائدین کو یہ امید ہے کہ بمبئی اور مہاراشٹر کے زندہ دل مسلمان ایک بار پھر اپنی پوری طاقت کے ساتھ تحفظ شریعت کی مہم میں شریک ہوں گے، اور ان تازہ حملوں کا مقابلہ پورے اتحاد، اور عزم وحوصلے اور منصوبہ بندی کے ساتھ کر کے اپنی تاریخ دہرائیں گے —— یہ ناچیز مدیر الفرقان تمام مدارس، مکاتب، تمام جماعتوں اور بلا لحاظ مسلک ومشرب تمام ہی علماء اور مشائخ سے گذارش کرتا ہے کہ وہ اس اجلاس کو کامیاب کرنے کے لئے بھرپور جدوجہد بھی کریں، اور دعاؤں کا بھی اہتمام فرمائیں، اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

☆☆☆

محفل (۱۱۳)☆ سورۃ النساء (۱۸)

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

اسلام میں خیانت کاروں کے لئے کوئی جگہ نہیں!

اور ہدایت کی راہ واضح ہوجانے کے بعد اس سے انحراف جہنم کی راہ ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِیْنَ خَصِیْمًا ۙ﴿۱۰۵﴾ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۚ﴿۱۰۶﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا ۙ﴿۱۰۷﴾ یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫ فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَمْ مَّنْ یَّكُوْنُ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ﴿۱۰۹﴾ وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ یَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ یَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا یَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ یَّكْسِبْ خَطِیْٓـَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا ﴿۱۱۲﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ یُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَیْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ

☆ الفرقان مارچ 2012 میں محفل قرآن کی جو قسط پیش کی گئی تھی، وہ دراصل زیر نظر شمارے (اپریل 2012) میں شائع ہونی چاہئے تھی اور یہ والی قسط مارچ کے شمارے میں آنی تھی، یہ اس سلسلہ کی قسط ۱۱۳ ہے اور سورۂ نساء کی قسط ۱۸، مارچ کے شمارے میں شائع ہونے والی قسط کا نمبر درست کرلیں وہ قسط ۱۱۴ ہے اور سورۂ نساء کی قسط ۱۹، ترتیب کی اس غلطی پر ادارہ معذرت خواہ ہے۔

عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾

ترجمہ

ہم نے نازل تم پر (اے نبی) کی ہے یہ کتاب حق کے ساتھ تا کہ تم فیصلہ لوگوں کے درمیان کرو اللہ کی رہنمائی کے مطابق اور خیانت کاروں کے طرفدار تم نہ بنو (۱۰۵) اور معافی اللہ سے چاہو، اللہ بیشک غفورُ رَّحیم ہے (۱۰۶) اور ان لوگوں کا دفاع نہ کرو جو اپنے نفسوں سے خیانت کرتے ہیں۔ بیشک اللہ نہیں ایسے لوگوں کو پسند کرتا جو پرلے درجے کے خیانت کار و بدکار ہیں (۱۰۷) یہ لوگوں سے تو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، پر اللہ سے نہیں شرماتے جو کہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ راتوں کو چھپ چھپ کے وہ باتیں کیا کرتے ہیں جنھیں وہ پسند نہیں کرتا۔ اور اللہ احاطہ کئے ہوئے (اپنے علم سے) ان سب باتوں کا ہے جو وہ کرتے ہیں (۱۰۸)۔

اچھا، یہ تم لوگ جو جھگڑتے ان کی طرف سے ہو دنیاوی زندگی میں، تو وہ کون ہوگا جو جھگڑا ان کے دفاع میں اللہ سے کرے گا قیامت کے دن، یا ذمہ داران کا بنے گا (۱۰۹) اور (سنو کہ) جو کوئی برائی کرلے یا ظلم اپنی جان پر ڈھالے وہ پھر معافی کا طلبگار اگر اللہ سے ہوجائے تو وہ اللہ کو پائے گا بڑا مغفرت کرنے والا رحم فرمانے والا (۱۱۰) اور جو کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اپنی جان ہی پر ستم کرتا ہے۔ اور اللہ خوب جاننے والا حکمت والا ہے (۱۱۱)۔ اور جو کوئی بدی کرے اور پھر اس کا الزام دوسرے کے سر رکھ دے تو وہ ایک بہتان اور بالکل کھلے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ (۱۱۲)

اور (اے نبی) اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو ان لوگوں کے ایک گروہ نے تو تہیّہ ہی کرلیا تھا کہ تمھیں غلط راہ پر ڈالدیں، حالانکہ یہ اس طرح بد

راہ نہیں کرتے ہیں مگر اپنے ہی آپ کو اور تم کو کوئی ذرا بھی نقصان نہیں پہنچاتے۔ اور اللہ نے نازل تم پر کی ہے کتاب وحکمت اور تمھیں سکھایا ہے وہ جو تم نہیں جانتے تھے۔ اور (المختصر) اللہ کا بڑا ہی فضل تم پر ہے (۱۱۳) کوئی بھی بھلائی (کی بات) ان لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں نہیں ہوتی۔ ہاں بھلائی اس شخص کی سرگوشی میں بیشک ہے جو صدقے کی بات کرے یا کسی نیکی کی یا اصلاح بین الناس کی۔ اور جو کوئی اللہ کی رضا طلبی میں ایسا کرے گا اسے ہم عنقریب بڑا اجر دیں گے (۱۱۴) اور جو کوئی مخالفت رسول کی اس کے بعد بھی کہ کرے کہ ہدایت کی راہ اس پر واضح ہو چکی ہو اور مؤمنین کی راہ چھوڑ کر کئی دوسری راہ چلے تو ہم اسی طرف اُسے لے چلیں گے جس طرف وہ چلا اور جہنم میں اسے جھونکیں گے۔ اور برا ٹھکانہ وہ ہے (۱۱۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت کا ایک مقدمہ

آیتیں بتا رہی ہیں کہ یہ کسی مقدمے کا قصہ ہے۔ اور اس کا تعلق بھی کچھ منافقین سے ہے اور کچھ ایسی ہی قابلِ گرفت صورت اس میں بھی پیش آئی ہے جیسی ایک دوسری صورت میں اوپر گزری ہوئی آیتیں (مَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ۔۔۔ یہ کیا ہوا ہے کہ منافقوں کے باب میں تم لوگ دو گروہ بن گئے؟) نازل ہوئیں تھیں۔ روایاتِ حدیث میں یہ قصہ تفصیل سے آیا ہے، مگر اس میں کئی بیان ہیں۔ زیادہ مشہور یہ ہے کہ انصارِ مدینہ کے گھرانوں میں کے کچھ لوگ جو بدقسمتی سے منافق تھے انھیں میں کے ایک خاندان (بنو اُبَیرق) میں بُشَیر نامی ایک شخص بھی تھا۔ اسی خاندان کی ایک شاخ میں مشہور صحابی قتادہ بنِ نعمانؓ ہوتے تھے، ان سے ترمذی (کتاب التفسیر) میں روایت آتی ہے کہ ان کے چچا رفاعہ بنِ زید کے گھر میں نقب زنی سے چوری ہوئی جس میں ان کے ہتھیار بھی چلے گئے ہیں۔ اس پر ہم نے پتہ چلانے کی کوشش کی تو یہ کام بُشیر ہی کا نظر آیا۔ چنانچہ ہم اس کے گھر والوں کے پاس گئے تاکہ کم از کم ہتھیار واپس مل جائیں۔ بشیر نے اس پر ایک اچھے مسلمان کا نام لے کر کہا کہ یہ کام اس کا ہے۔ اور اس کی خبر جب ان لوگوں کو لگی تو طیش میں تلوار کھینچے بنواُبیرق میں پہنچے کہ ثابت کرو۔ وہاں لوگوں نے عذر معذرت کر کے ان کا غصہ ٹھنڈا کر لیا۔ اس پر شبہ بشیر کے بارے میں اور بھی پکا ہو ہی جانا چاہئے تھا۔ اس لئے رفاعہ بن زید نے اپنے بھتیجے قتادہؓ سے کہا کہ تم اگر کر سکو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ واقعہ عرض کر دو اور یہ کہ میں صرف ہتھیاروں کی واپسی پر

راضی ہوجاؤں گا۔ چنانچہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں معاملہ پیش کیا۔ لیکن کوئی ثبوت نہ ہونے کی بنا پر بُشیر اور اس کے حامیوں نے جب انکار کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قتادہ سے فرمایا کہ تم بے ثبوت الزام لگا رہے ہو۔ اور قریب تھا کہ آپ ان کا دعویٰ خارج کردیں تب یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ جس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتہ چلا کہ قتادہ ہی سچے ہیں۔

ترمذی کے علاوہ بعض دوسروں کی روایت، روح المعانی کے مطابق، یہ ہے کہ یہ ایک یہودی کی امانت میں طُعمہ نامی ایک منافق کی خیانت کا معاملہ تھا۔ اور اس نے اپنے آپ کو بری دکھانے کے لئے وہ امانت (جو ایک زرہ تھی) اپنے پڑوسی انصاری کے احاطہ (دارِ ابوملیک) میں ڈالدی۔ اور جیسا کہ ہوتا ہے اس جھگڑے میں طعمہ کو اپنے کنبے اور تعلق والے حمایتی بھی مل گئے۔ چنانچہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدالت میں پہنچا تو ان لوگوں کے بیانات سے آپ کا رجحان یہودی کے خلاف فیصلہ کا بنا، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ اب آیتوں میں خیانت اور خائنوں کے الفاظ پہ نظر کی جائے تو یہی دوسری روایت (جو معاملے کو خیانت کا معاملہ بتا رہی ہے) قرینِ قیاس بنتی ہے۔

بہرحال اب قرآنی ارشاد کی طرف آیئے۔ فرمایا جارہا ہے کہ ''(اے نبی) ہم نے تم پر بالکل حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ اللہ کی رہنمائی کے مطابق کرو۔ پس تم خیانت کاروں کے طرفدار مت بنو۔ اور استغفار اللہ سے کرو کہ اللہ غفور رحیم ہے۔ اور ان لوگوں کی وکالت نہ کرو جو اپنے نفسوں کے ساتھ خیانت کر رہے ہیں۔ بیشک اللہ ایسوں کو پسند نہیں کرتا جو پرلے درجے کے خیانت کار اور معصیت شعار ہوں۔ اور لوگوں سے شرماتے مگر اللہ سے نہ شرماتے ہوں جسے ہر بات کی خبر ہے۔۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تنبیہی خطاب کی حقیقت

ان ارشادات سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی قابلِ گرفت کام سرزد ہوگیا ہو، حالانکہ واقعہ کی روایات کی روشنی میں ایسی کوئی بات نہیں نظر آتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو بطور جج کے دونوں طرف کے بیانات سن کر اپنے رجحان ہی کے مطابق فیصلہ دینا تھا۔ اور اس بارے میں آپ سے متعدد موقعوں پر فرمانا ثابت ہے کہ ''میں ایک بشر ہوں اور جو کچھ اہلِ مقدمہ کی طرف سے سنتا ہوں اس کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہوں، پس یہ ہوسکتا ہے کہ ایک فریق اپنا کیس زیادہ مؤثر انداز میں پیش کرکے اپنے حق میں (ناحق) فیصلہ کرالے۔۔۔'' (ابنِ کثیر بحوالہ صحیحین)۔ پس اب ان تنبیہی آیاتِ کا کیا مطلب سمجھا جائے؟

اصل بات تو اللہ ہی جانے اور وہ ''لا یُسئَلُ عَمّا یَفعَل'' کی شان رکھتا ہے۔لیکن دو باتیں اس مسئلے میں کہی جاسکتی ہیں جن میں سے ہر ایک اس خلش کو دور کرنے کے لئے کافی ہے۔ایک یہ کہ یہ اُسی طرح کا ارشادِ حق ہے جیسے سورۂ احزاب کی پہلی ہی آیت میں آتا ہے:یٰٓاَیُّھا النَّبِیُّ اتّقِ اللہَ وَلَا تُطِع الکافرینَ و الْمُنافِقِینَ۔۔۔ ترجمہ کیجئے تو وہ یہ ہوگا''اے نبی اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں کا کہا مت مانو!'' تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے واقعی ایسی کوئی بات ہوئی تھی یا اس کا خطرہ ہوسکتا تھا جس سے منع کیا جارہا ہے؟ ہرگز نہیں۔اس لئے مطلب اس آیتِ احزاب کا صرف یہ ہوگا کہ اے نبی اپنے تقوے پر اور کفار و منافقین سے ناسازگاری کی روش پر مضبوطی سے قائم رہو۔جبکہ یہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ تمھیں ہلا دیں!''پس ایسے ہی سورۂ نساء کی اس آیت میں آپ کو دراصل تلقین فرمائی جارہی ہے کہ فیصلوں کے معاملے میں آپ کی روش جواب تک رہی ہے اس میں فرق نہیں آنا چاہئے، چاہے کسی کی حمایت میں کیسی ہی بھیڑ جمع ہو کے آجائے۔لہٰذا اس تلقین میں جو ایک تنبیہی گرفت کا پیرایہ اختیار فرمایا گیا ہے اس کا رُخ حقیقت میں آپ کی طرف نہیں بلکہ ان لوگوں کی طرف ہے جو ایک ایسے خائن کی طرفداری میں آکھڑے ہوئے تھے جو کھلا منافق بھی تھا، اور ساتھ میں یہ ایک فرقہ وارانہ جنبہ داری کا معاملہ بھی بن رہا تھا، کہ فریقِ ثانی یہودی تھا۔(خائن کے کھلے منافق ہونے کا اشارہ آگے ''وَمَنْ یُشاقِقِ الرسول۔۔۔'' والے فقرہ میں آرہا ہے۔)

الفاظ میں مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بنا کر واقعہ میں خطاب اُمتیوں سے مقصود ہونا یہ بات اور بھی بعض جگہ ملتی ہے اور وہاں بالکل واضح بھی ہے۔مثلاً سورۂ طلاق میں طلاق کی بابت ایک عام ہدایت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے:''یٰٓاَیُّھا النبیُّ اِذا طَلَّقْتُمُ ا النِّسَآء۔۔۔۔اور اس طرزِ خطاب سے جو زور کسی معاملے پر تنبیہ میں پیدا ہوجاتا ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔اور یہ بات کہ یہاں تنبیہ کا رُخ حقیقت میں ان لوگوں کی طرف ہے جو ایک خائن کے طرفدار بن رہے تھے، ابھی بالکل صاف طور سے خود سامنے آنے والی ہے۔اور مزید غور کیجئے تو اس طرح اس موقع پر پوری امت کو وہ سبق دراصل یاد دلایا جارہا ہے جو اسی سورہ میں کچھ پہلے گزرا''اِنَّ اللہَ یَاْمُرُکُم اَنْ تُؤَدُّوا الاٰمٰنٰتِ اِلیٰ اَھْلِھا وَاِذا حَکَمْتُم بَیْنَ النّاسِ اَنْ تَحْکُمُوا بِالعدل (۸۵) الغرض بہت حکمتیں اس طرزِ کلام میں ہیں۔

تنبیہ کے رُخ کی اصل حقیقت کا ثبوت

آگے فرمایا گیا:ھٰٓاَنْتُمْ ھٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا قف فَمَنْ یُّجَادِلُ اللہَ

عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔۔۔(تم لوگوں نے اس دنیا میں تو ان (خائنوں) کی مدافعت کر لی لیکن قیامت کے دن ان کی مدافعت اللہ کے سامنے کرنے والا کون ہوگا، یا کون ہوگا کہ ان کا کام بنانے کی ذمہ داری لے؟ یہ ہیں وہ الفاظ جو بتا رہے ہیں کہ خائن کی مدافعت اور طرفداری کرنے والے اصل میں اُس کے حامیان تھے ،نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ تاہم اللہ کی طرف سے تو ساری کوشش بندوں کو راہِ راست پر لانے اور بدانجامی سے بچانے ہی کی ہوتی ہے جب تک وہ اپنے اوپر لعنت کی مہر نہ لگوالیں۔ پس ان کی اس نازیبا حرکت پر زجر و ملامت کے بعد بھی انھیں راندۂ درگاہ نہیں کیا جا رہا بلکہ واپسی کا راستہ دکھانے کے لئے فرمایا جا رہا ہے: وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ۔۔۔(اور سنو کہ جو شخص کوئی برائی یا خود اپنے نفس پر ظلم کرے اور پھر اللہ سے معافی مانگے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا رحم کرنے والا پائے گا۔ اور (دیکھو) جو کوئی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ دراصل اپنی جان ہی کے خلاف برائی کرتا ہے۔ اور جس کسی نے کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کیا اور پھر اسے کسی بے گناہ کے سر لگا دیا تو اس نے ایک بڑا بہتان اور کھلا گناہ اپنے سر لیا۔ آیت کے آخری (خط کشیدہ) الفاظ میں واقعہ کی روایت کے اس حصہ کی تلمیح نظر آ رہی ہے جس کے مطابق چوری یا خیانت کر کے مجرم نے نام دوسرے کا لگا دیا تھا۔

تنبیہ کا واقعی رُخ آپؐ کی طرف نہ ہونے کا مزید ثبوت

نیز ارشاد ہوتا ہے: وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ط ۔۔۔(اور جو اللہ کا فضل اور اس کی رحمت اے نبی تمھارے شاملِ حال نہ ہوتی تو ان میں کے ایک گروہ نے تو طے کر لیا تھا کہ تم کو غلط راہ پہ ڈال دے، لیکن ایسی حرکتوں سے وہ بس اپنے ہی آپ کو غلط راہوں میں ڈال رہے ہیں تمھیں یہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔) اس آیت نے بالکل ہی صاف کر دیا کہ لوگوں نے کوشش تو بھرپور کی تھی مگر اللہ کے فضلِ خاص نے ان کا داؤں آپؐ پر بالکل نہ چلنے دیا۔ اور خلافِ عدل کوئی فیصلہ وہ آپ سے حاصل نہ کر سکے۔

آیت کے وہ الفاظ جو کہہ رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو راہ سے بے راہ کرنے کا تہیّہ تھا، ان کے مطابق خیانت کار کے حامیوں میں اصل گروہ منافقوں ہی کا ہونا چاہئے، جو شمار بہر حال مسلمانوں ہی میں ہوتے تھے، اور وہی ایسی کافرانہ سوچ رکھ سکتے تھے کہ رسول اللہ کو گمراہ کریں۔ آگے بظاہر اللہ کے فضلِ خاص کی تشریح میں ارشاد ہوا ہے: وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ

تَعْلَمْ ط (تمھارے اوپر کتاب اتاری اور حکمت نازل کی اور تمھیں وہ کچھ سکھایا جو تم نہ جانتے تھے۔) گویا اسی کی برکت سے بدقماشوں کا منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا۔

گناہگاروں کو نیک راہ پر لوٹ آنے کی ترغیب

آگے آتا ہے: لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ط بعض اقوال کے مطابق یہ لوگوں کا ایک عام حال بیان کیا جارہا ہے۔اور واقعۃً لوگوں کا عام حال یہی ہے کہ ان کی سرگوشیاں اور کانا پھونسیاں بالعموم اچھے کاموں کے لئے نہیں ہوتیں،لیکن ربطِ آیات پر نظر کرتے ہوئے یہاں اس ارشاد کا اوّلین اشارہ ان لوگوں کی طرف لیا جانا زیادہ موزوں لگتا ہے،(اور یہی رجحان صاحبِ روح المعانی کا بھی ہے) جن کے بارے میں اوپر آیا تھا: لوگوں سے شرماتے ہیں مگر اللہ سے نہیں جس سے ان کی راتوں کی خفیہ مشاورتیں بھی چھپی ہوئی نہیں ہوتیں۔۔۔بہرحال،فرمایا گیا ہے کہ ''ان کی سرگوشیوں میں عموماً کوئی بھلائی نہیں ہوتی،ہاں جو لوگ سرگوشیوں میں صدقہ خیرات کی یا کسی اور بھلے کام کی یا لوگوں کے تعلقات کی اصلاح کی بات کرتے ہیں وہ بھلائی کی سرگوشیاں ہیں۔'' اور اس کے بعد قرآن کے عام نہج کے مطابق بھلائی کی ترغیب کے لئے ارشاد فرمایا گیا: وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ (اور جو کوئی بھلے کاموں کی یہ سرگوشیاں رضائے الٰہی کی طلب میں کرے گا اسے ہم بڑے اجر سے نوازیں گے۔

جو لوگ ترغیبِ خیر پر کان نہیں دھرتے اُن کا انجام!

صورۃً نیک کام بہت سے لوگ کرتے ہیں اور بالعموم اس کا کچھ نہ کچھ فائدہ انھیں دنیا میں ملتا ہے،مگر آخرت کے فائدے کے لئے شرط ہے کہ وہ کام اللہ کو خوش کرنے کی نیت سے کیا جائے۔اللہ کے رسول جو باتیں لوگوں کو بتانے کے لئے آتے ہیں انھیں میں سے ایک،اور بہت اہم، یہ اجرِ آخرت کی بات ہے۔مگر بدنصیب لوگوں کو اپنے فوری فائدوں کے چکر میں یہ نصیحتیں اور اس کے مطابق روک ٹوک کا نظام اچھا نہیں لگتا اور خودسری پر آمادہ ہوتے ہیں،آخری آیت میں ایسے لوگوں کو آگاہی دینے کے لئے فرمایا گیا ہے: وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔۔۔(اور جو کوئی ہدایت کی راہ واضح ہوجانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے گا اور مؤمنین کی راہ سے ہٹ کر راہ چلے گا تو ہم اسے چھوٹ دیں گے اپنی اختیار کردہ راہ پر جانے کی اور پھر جہنم میں اسے جھونکیں گے۔اور بری جگہ جہنم ہے انجام کے اعتبار سے۔)

یہ آگاہی بھی اپنے مفہوم میں گرچہ بالکل عام ہے، مگر سیاقِ کلام کے اعتبار سے اس کا باعث اس خیانت کار (طُعمہ یا بُشیر) کی خودسری اور سرکشی ہے کہ روایات کے مطابق وہ سزا سے بچنے کے لئے مرتد ہوکر مکہ کی طرف بھاگا اور وہیں جہنم رسید ہوا۔ اوپر اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا گیا تھا کہ اس خائن کے کھلے منافق ہونے کی ایک علامت آخر میں آرہی ہے۔ وہ اشارہ اسی آیت کی طرف تھا۔ ارتداد کی طرف آسانی سے قدم وہی اٹھا سکتا ہے جس نے منافقت کے سب درجے طے کر لئے ہوں اور اب بس کھلا کافر بن جانے کی کسر ہو۔ اللّٰھم لا تَجعلنا مِنھم، و اجعلنا منَ الذین قالوا سمعنا و اطعنا، غفرانکَ ربّنا والیکَ الْمصیر!

آیت کا نہایت اہم نکتہ

اس آیت میں ایک یہ بات بہت اہم اور قابلِ لحاظ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت اور مؤمنین کے طریقے کے ترک کو ہم معنیٰ قرار دیدیا گیا ہے۔ گویا ایک آدمی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کا اعلان نہیں کرتا مگر مسلمانوں کے متفق علیہ عقائد اور طریقِ زندگی کو ترک کر دیتا ہے تو وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت سے الگ کوئی بات نہیں ہے۔

☆☆☆

الفرقان کی ملکیت و دیگر تفصیلات کے متعلق اعلان

(مطابق فارم ۴ دیکھئے قاعدہ نمبر ۸)

مقامِ اشاعت: لکھنؤ وقفۂ اشاعت: ماہانہ

پرنٹر و پبلشر کا نام: محمد حسان نعمانی (۳۱، نیا گاؤں مغربی لکھنؤ) قومیت: ہندوستانی

ایڈیٹر کا نام و پتہ: خلیل الرحمٰن سجاد (۳۱، نیا گاؤں مغربی لکھنؤ) قومیت: ہندوستانی

ملکیت: خلیل الرحمٰن سجاد

میں محمد حسان نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہیں۔

دستخط

محمد حسان نعمانی

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا جہاد ''تجدید''

(قسط دوم)

[اس مقالہ کی گذشتہ قسط میں آپ نے پڑھا تھا کہ کس بصیرت، درد اور حکمت کے ساتھ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ہندوستان کے برسر اقتدار طبقے کا رخ از سر نو اسلام کی طرف پھیرا تھا، اور ملک کے سر برآوردہ طبقے کو الحاد و ارتداد کے گرداب سے نکال کر اسی سے اس ملک کے قبلہ کی درستگی کا کام لیا تھا —— اس شمارے میں آپ پڑھیں گے کہ علماء سوء اور گمراہ کن صوفیوں کے زیغ وضلال سے انھوں نے کس طرح دین حق کی حفاظت وتجدید کی عظیم خدمت انجام دی —— ادارہ]

حکومت کے مورچہ کو تو حضرت مجددؒ نے اس طرح فتح کیا، اب رہ گئے علماء سوء اور نفس پرست گمراہ کن ''صوفی'' ان کی قوت بھی آپ کے اسی ایک وار سے بہت کچھ ختم ہوگئی کیونکہ ان کا فتنہ صرف اسی لئے روبہ ترقی تھا کہ حکومت کی رفتار اس کے مناسب مزاج تھی جب حکومت ہی کا رخ بدل گیا تو باطل کی یہ دونوں قوتیں بھی کمزور پڑ گئیں —— بااین ہمہ ان کی گمراہیوں کے خلاف بھی آپ نے مستقل جنگ کی۔

علماء سوء نے گمراہی کے دو بڑے دروازے کھول رکھے تھے

(۱) ایک باوجود نااہلیت اور ناخدا ترسی کے ادعاء اجتہاد اور نصوص کتاب وسنت میں تحریف معنوی کر کے نت نئے عقائد وخیالات کا اختراع اور پھر خدا اور رسول اور قرآن وحدیث کے مقدس ناموں سے ان کی ترویج واشاعت (ابوالفضل وغیرہ نے اکبر کو سب سے پہلے اسی راہ پر ڈالا تھا خود ان کی گمراہی کا پہلا زینہ بھی یہی تھا)۔

(۲) دوسرے ''بدعت حسنہ'' کے نام سے دین میں نئی نئی ایجادیں —— اکثر وہ بلائیں جو علماء

سوء کی طرف سے دین پر نازل ہوتی تھیں انھیں دو دروازوں سے آتی تھیں اس لئے حضرت مجددؒ نے ان دونوں تباہ کن اصولوں کے خلاف بھی بڑی قوت سے جنگ کی۔

مکتوبات شریف میں ان دونوں چیزوں کے خلاف جس قدر مواد موجود ہے اگر اس سب کو یکجا کیا ئے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے یہاں صرف بطور ''نمونہ از خروارے'' چند اقتباسات ملاحظہ ہوں ایک مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:

''اے سعادت مند! ہم پر اور تم پر ضروری ہے کہ اپنے عقائد کو کتاب وسنت کے مطابق اس طور پر کہ جس طریقے پر علماء اہل حق نے کتاب وسنت سے سمجھا اور اخذ کیا ہے صحیح کریں کیونکہ ہمارا تمہارا سمجھنا اگر ان حضرات کی رائے کے مطابق نہ ہو تو قابل اعتبار نہیں، اس لئے کہ ہر بدعتی اور گمراہ اپنے باطل خیالات کی بنیاد قرآن حدیث ہی پر رکھتا ہے اور وہیں سے اس کو اخذ کرتا ہے حالانکہ ان سے کوئی یقین حاصل نہیں ہوتا۔ (مکتوب ۱۵۸، دفتر اول)

ایک دوسری جگہ ارقام فرماتے:

مکلفین پر اولین فرض یہ ہے کہ وہ حضرات اہل سنت وجماعت کی رائے کے مطابق اپنے عقائد درست کریں کہ کیونکہ نجات اخروی ان ہی کی اتباع سے وابستہ ہے اور فرقۂ ناجیہ وہی ہیں اور ان کے پیرو، کیونکہ وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے طریقہ پر ہیں اور کتاب وسنت سے جو علوم مستفاد ہیں ان میں سے وہی معتبر ہیں جن کو ان بزرگوں نے وہاں سمجھا اور اخذ کیا ہے ورنہ ہر بدعتی اور گمراہ اپنے عقائد فاسدہ کی بنیاد کتاب وسنت ہی پر رکھتا ہے پس قرآن وحدیث ہی سے جو شخص جو معنی سمجھے وہ سب معتبر نہیں ہے۔''

(مکتوب ۱۹۳، دفتر اول ص ۱۹۲)

ایک اور موقع پر تحریر فرماتے ہیں:

''خدا تم کو نیک ہدایت دے اور صراط مستقیم پر چلائے تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ضروریات طریق میں سے ایک اعتقاد صحیح بھی ہے جس کو علماء اہل سنت نے کتاب وسنت اور آثار سلف سے سمجھا ہو نیز قرآن وحدیث کو ان ہی معانی پر محمول کرنا جو جمہور علماء اہل سنت نے سمجھے

ہوں یہ بھی ضروریات میں ہے اور اگر بالفرض کشف والہام سے جمہور علماء کے خلاف کسی نص کے معانی معلوم ہوں تو اس کا اعتبار نہیں بلکہ اس سے پناہ مانگنا چاہئے کیونکہ جمہور علماء کی آراء کے خلاف جو معانی سمجھے جائیں وہ مقام اعتبار سے قطعاً ساقط ہیں اس لئے کہ ہر مبتدع اور گمراہ اپنے معتقدات کو بزعم خود قرآن وحدیث ہی سے نکالتا ہے قرآن کی تو شان ہے: **یُضِلُّ بہ کثیرًا و یھدی بہ کثیرًا**۔ اور یہ جو میں نے دعوی کیا کہ علماء اہل حق کے سمجھے ہوئے ہی معانی معتبر ہیں اور ان کے خلاف کسی اور کے سمجھے ہوئے معتبر نہیں تو یہ اس واسطے کہ علماء اہل حق نے ان معانی کو صحابۂ کرام اور سلف صالحین کے چشمۂ فیوض سے حاصل کیا ہے اور ان ہی کے انوار سے اقتباس فرمایا ہے لہٰذا نجات ابدی اور فلاح سرمدی ان ہی سے وابستہ ہے وہی خدائی گروہ ہے اور خدائی گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔'' (مکتوب ۲۸۶، دفتر اول ص ۳۷۳)

جیسا کہ عرض کیا جا چکا دفاتر مکتوبات میں اس موضوع پر بہت سے مجمل اور مفصل مکاتیب موجود ہیں جس میں گمراہی کے اس چشمہ پر بند لگانے کی کوشش کی گئی ہے ——— ذرا غور وفکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ آج بھی جو نئی نئی خطرناک گمراہیاں امت میں پیدا ہو رہی ہیں ان کی اصل و بنیاد یہی ہے کہ ہر ''بوالہوس'' اپنے کو ''ابوحنیفہ کوفی'' اور سفیان ثوری، ابوالحسن اشعری اور ابومنصور ماتریدی، ابن تیمیہ حرّانی اور امام غزالی کے ہمسر سمجھتا ہے اور بلا ادنیٰ تامّل وتردد کے کتاب وسنت ہی کا نام لے کر نئے نئے فتنے برپا کرتا ہے۔ نیچریت مرزائیت، چکڑالویت اور مشرقیت کیا یہ سب اسی گمراہی وتقلید سلف سے آزادی کے کرشمے نہیں ہیں؟

''بدعت حسنہ'' کا نظریہ بھی جس کے پردہ میں اس عہد کے علماء سوء نے اپنی خواہشات نفس کو جزوِ دین بنا رکھا تھا، حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی نظر میں سخت خطرناک تھا اس لئے آپ نے اس نظریہ ہی کے خلاف جنگ کی اور بلا خوف لومۃ لائم بالکل مجددانہ انداز میں کسی بدعت کے حسنہ ہونے ہی سے انکار فرمایا۔

خواجہ مفتی عبدالرحمٰن کابلی کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''یہ فقیر حق سبحانہ تعالی سے نہایت عاجزی وزاری کے ساتھ دعا کرتا ہے کہ دین میں جو نئی

نئی باتیں پیدا کی گئی ہیں اور جو بدعتیں ایجاد کی گئی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے خلفاء کے زمانے میں موجود نہ تھیں اگرچہ وہ روشنی میں سفیدیِ صبح کی طرح ہوں پھر بھی اس ناتواں کو ان سے محفوظ رکھے اور ان میں مبتلا نہ کرے ۔۔۔۔ کہتے ہیں کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں حسنہ اور سیئہ۔۔۔۔۔ یہ فقیر ان بدعات میں سے کسی بدعت میں بھی حسن ونورانیت نہیں دیکھتا اور بجز ظلمت وکدورت کے ان میں کچھ نہیں محسوس کرتا سرکار بنی آدم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: جو ہمارے دین میں ایسی بات ایجاد کرے جو اس میں نہیں ہے تو وہ چیز مردود ہے۔ پس جو شیء مردود ہوگئی اس میں حسن کیسا۔ نیز آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے تم بچو نوایجاد باتوں سے کیونکہ ہر نوایجاد بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے پس جب ہر نوایجاد بدعت ہوئی اور ہر بدعت گمراہی پھر بدعت میں حسن کے کیا معنی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں کے نور کو بدعات کے اندھیروں میں چھپا دیا ہے اور ملت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رونق کو ان نوایجاد بدعتوں کی کدورتوں نے برباد کر دیا ہے کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک جماعت ان بدعات کو مستحسن جانتی ہے اور ان کو نیکیاں سمجھتی ہے اور ان کے ذریعہ سے دین وملت کی تکمیل کرنا چاہتی ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سیدھے راستے کی ہدایت دے ۔ لوگ نہیں جانتے کہ دین ان بدعات سے پہلے کامل ومکمل ہو چکا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے آج ہم نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے لئے دین اسلام پسند کیا پس دین کا کمال ان بدعات میں سمجھنا درحقیقت اس آیت کریمہ کے مضمون سے انکار کرنا ہے''۔

(مکتوب ۲۶۱، دفتر اول ص ۳۰۳)

ایک اور موقع پر ارقام فرماتے ہیں:

''ہر زمانے میں عموماً اور غربت اسلام کے اس دور میں خصوصاً دین کا بقاء وقیام سنتوں کی ترویج اور بدعتوں کی تخریب سے وابستہ ہے بعض اگلوں نے بدعات میں کوئی حسن دیکھا ہوگا کہ اس کے بعض افراد کو انھوں نے مستحسن قرار دیا۔ اس فقیر کو ان سے اس مسئلہ میں اتفاق نہیں میں کسی فرد بدعت کو حسنہ نہیں سمجھتا اور سوائے ظلمت وکدورت کے مجھے ان میں

کچھ نہیں محسوس ہوتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کلُّ بدعۃٍ ضلالۃ ہر بدعت گمراہی ہے فقیر کے نزدیک اسلام کی اس غربت کے زمانے میں سلامتی سنت سے اور خرابی اور بربادی بدعت سے وابستہ ہے خواہ کوئی بدعت ہو، بدعت اس فقیر کو کدال کی صورت میں نظر آتی ہے جو اسلام کی بنیاد کو ڈھا رہی ہے اور سنت ایک درخشاں ستارے کے رنگ میں دکھائی دیتی ہے جو گمراہی کی شب تاریک میں رہنمائی کرتا ہے، حق سبحانہ وتعالی علمائے وقت کو توفیق دے کہ کسی بدعت کے حسنہ ہونے کے متعلق زبان نہ کھولیں اور کسی بدعت کے کرنے کا فتوی نہ دیں اگرچہ وہ بدعت ان کی نظر میں فلک صبح کی طرح روشن ہو کیونکہ شیطانی مکر کو ماسوائے سنت میں بڑا تسلط ہے۔۔۔۔۔۔۔۔اس وقت سارا عالم کثرت بدعات کی وجہ سے تاریکیوں کے ایک سمندر کی طرح نظر آتا ہے اور نور سنت اپنی غربت اور قلت کے باوجود اس دریائے ظلمت میں رات میں چمکنے والے جگنو کی طرح محسوس ہوتا ہے پھر بدعات کے عمل کی وجہ سے اس اندھیرے میں اضافہ اور روشنی میں کمی ہوتی ہے اور اس کے برعکس سنتوں سے اس ظلمت میں کمی اور نورانیت میں اضافہ ہوتا ہے اب جس کا جی چاہے اس بدعت کی تاریکیوں کو بڑھائے اور جس کی سمجھ میں آئے وہ انوار سنت میں اضافہ کرے۔جس کا جی چاہے شیطان کے لشکر کو بڑھائے اور جو چاہے خدا کی فوج کو ترقی دے مگر معلوم ہونا چاہئے کہ شیطانی لشکر والے ٹوٹے میں ہیں اور خدائی جماعت ہی کامیاب ہونے والی ہے، (مکتوب ۲۳، دفتر دوم ص ۳۹)

اس موضوع پر بھی دفاتر مکتوبات میں بیسوں بلکہ پچاسوں مکاتیب ہیں یہاں صرف تین ہی مکتوبوں کے ان اقتباسات پر اکتفاء کیا جاتا ہے اس کو تو ارباب نظر ہی کچھ سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ''بدعت حسنہ'' کا انکار کر کے کتنی گمراہیوں کا دروازہ بند کر دیا۔

جزاہ اللہ تعالی عن الاسلام وعن المسلمین جزاءً حسناً

☆☆☆

از افادات: حضرت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

معارف ومسائل

[یہ دیکھ کر کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی خاصی تعداد اسلام سے شعوری وعملی وابستگی کی طرف متوجہ ہورہی ہے، عارف باللہ حضرت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم نے گذشتہ دنوں ان نوجوانوں کی فکری وعملی تربیت کے مقصد سے مختلف مقامات پر ایسی علمی مجالس منعقد کیں، جن میں ایک ایک ہفتہ تک مختلف موضوعات پر ان کے سامنے اپنے مطالعہ کا حاصل پیش کیا گیا، اور ان کی ذہنی الجھنوں اور علمی اشکالات کے جوابات دئے گئے، اسی سلسلۂ محاضرات کی ایک کڑی پیش ہے ——— مدیر]

معارف ومسائل کے نام پر اِس عاجز نے بہت ساری کتابوں کا نچوڑ ایک جگہ کردیا ہے، ان فقرات کو اگر آپ یاد کرلیں گے تو آپ یوں سمجھیں کہ درجنوں کتابوں کا آپ نے مطالعہ کرلیا، آپ کی سہولت کے لئے یہ کوشش کی گئی ہے۔

انسان فطری طور پر تمدن چاہتا ہے۔

دنیا کا سارا فساد خودغرض عقل کی پیداوار ہے۔ دفعِ فساد کی واحد راہ آسمانی ہدایات کو قبول کرنا ہے۔

مکہ مکرمہ میں جب تک رہے تو عقائد، عبادات اور اخلاق کی تعلیم دی جاتی رہی، جب نبی علیہ السلام مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو اللہ رب العزت نے اسلام کا جو پورا ڈھانچہ تھا وہ عطا فرمادیا، چنانچہ ثقافت بھی اپنی اور سیاست بھی اپنی ہوئی۔

فقہ نبی علی السلام کے علم نبوت کا ہی ایک پھیلاؤ ہے، مجتہد مشتہر ہوتا ہے، مسائل کا موجد نہیں ہوتا، یعنی وہ مسائل خود نہیں بناتا ہے بلکہ احادیث کے اندر جو علوم چھپے ہوئے ہوتے ہیں ان کا اظہار کرتا ہے، ان لپٹے ہوئے موتیوں کو نکال کر سب کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ علم وہی ہے جس کے پیچھے کوئی گہرائی ہو۔

الفاظِ نبوت کی تبلیغ محدثین نے کی، اور معانیٔ نبوت کی تبلیغ فقہاء نے کی ہے۔

محدثین اور فقہاء دونوں میں انبیاء کے ساتھ زیادہ مشابہت فقہاء کو ملی، خصوصاً فقہاء محدثین کو۔

امام ابوحنیفہؒ ضعیف حدیث کو رائے اور قیاس پر مقدم کرتے تھے، ان کے یہاں یہ دستور تھا کہ اگر نبی علیہ السلام کی کوئی حدیث ملے اور اس کے راوی میں کوئی ضعف بھی آتا ہو مگر اس کو محدثین حدیث کا درجہ دیتے ہوں تو قیاس کے مقابلے میں اس حدیث پر عمل کرنا فضیلت رکھتا ہے۔ اب ذرا سوچئے کہ جو بندہ اتنا حدیث کی پابندی کرنے والا ہو اس کو کہا جائے کہ وہ دین میں اپنی رائے کو دخل دیتا ہے تو یہ اس پر کتنا بڑا الزام ہے۔

حدیث اگر سونا ہے تو فقہ اس کو کھرا رکھنے کی ضمانت ہے۔

اجتہاد میں کوئی صورت قطعی نہیں ہوتی ہر طرح کا احتمال ہوتا ہے۔

اجتہاد قرآن وحدیث کی برابری نہیں کرسکتا بلکہ اجتہاد ہوتا ہی وہیں ہے جہاں براہ راست اور صراحۃً نہ قرآن سے کوئی چیز ملتی ہے، نہ حدیث سے کوئی چیز ملتی ہے۔

مفتی اور مستفتی میں سے بوجھ کسی پر نہیں یعنی فتوی پوچھنے والا اور جس سے فتوی پوچھا جائے ان میں سے بوجھ کسی پر نہیں ہے، پوچھنے والے پر اس لئے نہیں کہ اس نے پوچھ کے عمل کیا اور بتانے والے پر اس لئے نہیں کہ اس نے اپنی طرف سے پوری علمی دیانت کے ساتھ تحقیق کرکے بتایا، اب اگر اس کی رائے بالکل ٹھیک ہوگی تو ڈبل اجر ملے اور اگر خطا بھی ہوئی تو ایک اجر ملے گا، اس میں سزا نہیں ہے، نہ پوچھنے والے کے لئے نہ بتانے والے کے لئے۔

مجلس تدوین فقہ حنفی نے بیس سال میں چھ لاکھ مسائل کے جوابات لکھے۔

تقلید، اہلِ کمال کی پیروی کا نام ہے۔ علمائے کرام بھی پہلوں کی تقلید سے آگے چلے ہیں۔

ائمہ اربعہ کا اختلاف صحابہ کے اختلاف جیسا ہے۔

جو یہ مانتا ہو کہ اجتہاد کی ضرورت ہے وہ تقلید کا منکر کبھی نہیں ہوسکتا، اس کو ماننا پڑے گا کہ صاحب اجتہاد کی اقتدا اُن سب کو کرنی پڑے گی جو اس رتبے پہ فائز نہیں ہیں۔

ہر ایک کے لئے دلیل جاننے کو ضروری ٹھہرانا معتزلہ کا مذہب ہے۔

امت کا آغاز ہی اعتماد سے ہوا۔ صحابۂ کرام میں عالم اَعلَم کی پیروی کرتے تھے۔

دلیل کی بحث مجتہدین کا موضوع ہے کہ وہ ایک دوسرے سے دلیل مانگتے ہیں، جیسے امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسف، امام محمدؒ، یہ حضرات جب بیٹھتے تھے تو دلیل سے بات کرتے تھے، بغیر دلیل کے ایک دوسرے کی بات نہیں قبول کرلیتے تھے، ایسا نہیں تھا کہ استاذ نے کہہ دیا تو شاگرد نے قبول کرلیا، وہاں دلیل ہوتی تھی،

اسی لئے کئی موقعوں پر وہ اختلاف بھی کرتے تھے، چنانچہ امام محمدؒ اور امام بو یوسفؒ نے تقریبا نوے فیصد مسائل میں امام صاحب کے قول پر فتوی دیا، مگر دس فیصد مسائل ایسے ہیں کہ جن میں انھوں نے ان سے اختلاف کر کے اپنی رائے کے اوپر ہی فتوی دیا۔

مقلد کی نظر سے اگر یہ گذرے کہ فلاں صحابی کا مسلک اس کے امام کی تحقیق سے مختلف ہے، تو ہرگز تشویش میں نہ پڑے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ دوسرے صحابہ کی رائے وہ ہو، یا کسی اور دلیل سے وہ رائے راجح قرار پائی گئی ہو جو اس کے امام نے اپنائی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ معتبر ائمہ کی تقلید غیر ضروری انتشار ذہنی سے بچا کر انسان کو اصلاحی اور تعمیری کاموں کی طرف یکسو کر دیتی ہے۔

مجتہد کا اجتہاد صحیح تو دوگنا ثواب اور اگر غلط تو ایک ثواب۔

دین میں ہمیشہ اوپر والوں کو دیکھنا چاہئے۔ فقہ میں بدعت کا کوئی پہلو نہیں۔

آج کل مجتہد مطلق ہونے کا دعوی کوئی کرے تو بات ہی نہ سنو۔

چاروں مسلک قرون ثلاثہ میں قائم ہوئے۔ یہ قرون ثلاثہ وہ تین دور ہیں جن میں خیر ہونے کی خوشخبری نبی علیہ السلام نے دی۔

حدیث کوئی بھی ہو تو اس پر عمل کرنے کے لئے یہ لازم ہے کہ صحابہ نے اس پر عمل کیا ہو، اگر نہیں کیا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ منسوخ ہے، یا کوئی اور بات ہے نبی علیہ السلام کا کوئی اور حکم ہوگا۔

مجتہد کے سائے میں مقلد کی خطا معاف ہو جائے گی۔

تقلید کا معنی جمود نہیں، ربط ملت ہے۔ علامہ اقبال کا شعر ہے:

معنئ تقلید ربط ملت است

محدثین نے ہمیشہ فقہاء کی برتری تسلیم کی۔ ائمہ اربعہ میں سے کوئی معصوم اور مامور من اللہ نہیں، سب سے حسن ظن رکھنا ضروری ہے، یہ نہیں کہ ہم امام اعظم ابوحنیفہؒ کی پیروی کرتے ہیں تو بس وہی ہیں اور باقی کوئی نہیں، سب کے ساتھ عقیدت ومحبت اور سب کی عظمت دلوں کے اندر رکھنی چاہئے۔

چاروں ائمہ میں سے کسی کی بھی اقتدا کرنے والے سارے کے سارے لوگ اہل سنت والجماعت میں داخل ہیں۔

اجتہاد سے جو مسئلہ نکلے گا وہ بھی شارع کی طرف منسوب ہوگا، اس لئے کہ کلیات تو وہاں سے لئے

گئے جس کے تحت اس جزئی کو نکالا گیا۔

چونکہ عقائد قطعی چیز ہوتی ہے اس لئے وہاں پر اجتہاد نہیں ہوتا، اعمال میں اجتہاد ہوتا ہے۔

عوام کو چاہئے کہ مجتہد کو شہرتِ عامہ اور اتباعِ علماء سے پہچانیں۔

فرقہ بندی فقہی مسالک کی وجہ سے نہیں، اعتقادی وجوہات سے ہے، کہ عقیدے میں کوئی کہتا ہے کہ یوں تھا کوئی کہتا ہے کہ یوں تھا، آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ حنفی، مالکی اور شافعی آپس میں گتھم گتھا ہو رہے ہوں، ان کا تو آپس کوئی ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا نہیں ہے، بلکہ سب متفق ہیں کہ اپنے اپنے امام کی اگر پیروی کریں گے تو سب نجات پائیں گے۔ کسی محدث نے ''**الردّ عَلٰی المسالک**'' یا ''**الرد علی الائمة**'' کا باب نہیں باندھا، یعنی محدثین نے مسالک اور ائمۂ فقہاء کا رد نہیں کیا۔

مجتہد کا اجتہاد قطعیات کے خلاف نہیں ہوتا۔ مجتہد کے اجتہاد میں اجماع کی مخالفت نہیں ہوا کرتی۔

اصول وعقائد کے اجتہاد قطعی درجے کے ہیں کہ ان کے جو مسائل ہوتے ہیں وہ قطعی درجے کے ہوتے ہیں۔ ائمۂ کرام کے فروعی اختلافات ظنی درجے کے ہیں۔

صحابۂ کرام اجتہادیات میں کسی دوسرے کو باطل پر نہ کہتے تھے، اگر ایک نے وضو کر کے نماز پڑھی دوسرے نے تیمم سے پڑھ لی تو دونوں ایک دوسرے کو صحیح سمجھتے، کوئی دوسرے کے اوپر طعن نہیں کیا کرتے تھے۔

فقہی مذاہب کو ایک کرنے کا دعویٰ مشیت ایزدی کے خلاف ہے، دل تو ہر بندے کا چاہتا ہے کہ سب ایک ہو جائیں لیکن جب اللہ کی مشیت ہے کہ میرے محبوب کی سب مختلف سنتوں پر پوری امت کے اندر عمل ہو تو ہم کو اس مشیت کے اوپر راضی ہونا چاہئے۔

وسعتِ عمل کبھی امت میں انتشار کا سبب نہیں بنی۔ اجتہادی امور میں ہر فریق ماجور ہے ماخوذ کوئی نہیں۔

فکری اختلافات لوازمِ بشریت میں سے ہے، چونکہ انسانوں کی عقلیں مختلف ہیں لہٰذا فکری اختلاف ایک دوسرے سے ہو جانا یہ کوئی بعید بات نہیں ہوتی۔

اجتہاد امت کی ضروریات میں سے ہے۔

انسان سلف کی بلا دلیل پیروی سے ہی سلفی بن سکتا ہے، اگر کوئی سلفی بننا چاہے تو اس کا ایک ہی حل ہے کہ اسلاف کی بلا دلیل پیروی کرے، ورنہ وہ سلفی کہاں رہا۔

☆☆☆

حال ہی میں سند فراغت حاصل کرنے والے فضلائے مدارس کے لئے

ایک زریں موقع

مدیر الفرقان مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی کی براہِ راست رہنمائی میں

معہد الامام ولی اللہ الدھلوی للدراسات الاسلامیہ

بمبئی اور پونہ کے درمیان ایک پرفضاء مقام پر خانقاہِ نقشبندیہ مجددیہ مدراپور نیرل

(تعلقہ کرجت) ضلع رائے گڑھ (مہاراشٹر) میں جاری ہے

جس میں دوسالہ نظام کے تحت

☆ دورِ حاضر میں تفسیر قرآن اور احادیث نبویہ کی تفہیم وتشریح کا معتبر اور مناسب اسلوب

☆ اصول دین واحکام شریعت/ فقہ اسلامی اور جدید تقاضے

☆ سیرت وتاریخ ☆ فکر اسلامی اور انسانی برادری میں دعوت کے اصول

☆ نوجوان علماء کرام کو انگریزی اور کمپیوٹر کے ساتھ بہتر علمی، فکری اور قلبی وروحانی صلاحیتوں سے آراستہ کیا جارہا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ خود اعتمادی اور کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوسکیں اور دور حاضر میں اسلام کی بہتر ترجمانی کرسکیں۔

خواہشمند طلبہ تحریری امتحان اور فارم کے لئے درج ذیل مراکز سے رجوع کریں

دیوبند	گجرات (خانقاہ فیض اولیاء ترکیسر)	لکھنؤ	نیرل (خانقاہ نقشبندیہ مجددیہ)
تاریخ امتحان: ۲۷/اپریل	تاریخ امتحان: ۴/مئی	تاریخ امتحان: یکم جون	تاریخ امتحان: ۸/جون
رابطہ: 9850376238	رابطہ: 9327583852	رابطہ: 9889336348	رابطہ: 9850376238

شرائط داخلہ:

۱۔ امیدوار کا دورۂ/ حدیث/ عالمیت، فضیلت یا اس کے بعد کسی مخصوص شعبہ میں تکمیل کی سند حاصل کرنا ضروری ہے۔

۲۔ سال فراغت کے امتحان میں حاصل شدہ مجموعی نمبرات کا کم از کم ۷۵ فیصد ہونا ضروری ہے۔

قیام وطعام اور ماہانہ وظیفہ، ادارہ کی جانب سے دیا جائے گا۔

وضاحت طلب امور کے لئے رابطہ کریں: 9850376238

مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی
ترتیب وپیشکش: محمد اختر معروفی

تبلیغ کی عظیم محنت کو سمجھئے
اور خدارا
اسے بدنام مت کیجئے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ کَفٰی وَ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ - بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ط وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۶۹﴾ (العنکبوت)
سُبْحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۔ وَ سَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ۔ وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ بَارِکْ وَ سَلِّمْ
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ بَارِکْ وَ سَلِّمْ
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ بَارِکْ وَ سَلِّمْ

انسانوں کی رہنمائی کے لئے انبیاء کرام کی بعثت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ایسا بنایا کہ ان کے اندر اچھائی کی صلاحیت بھی بھرپور رکھی اور برائی کی صلاحیت بھی بھرپور رکھی، اور انسانوں کو اختیار دے دیا کہ ''فَمَنْ شَاءَ فَلْیُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْیَکْفُرْ'' جو چاہے ماننے والا راستہ اختیار کرے اور جو چاہے نہ ماننے والا راستہ اختیار کرے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اس بات کا بھی زبردست انتظام فرمایا کہ انسانوں کو برابر بتایا جاتا رہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے، کسی سے برائی زبردستی نہیں چھڑوانی اور کسی سے اچھائی زبردستی نہیں کروانی، یہ انسان کی بلندیٔ مقام کے خلاف ہے، لیکن انسان کا حق اور اس کی بنیادی ضرورت ہے کہ اس کو ضرور بتایا جائے کہ تمہارے لئے کیا اچھا ہے اور کیا

برا ہے، کیا چیز مفید ہے اور کیا چیز مضر ہے، اسی کام کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام بھیجے، جنھوں نے بہت تکلیفیں تو برداشت کیں لیکن اپنے اپنے زمانے میں اپنی اپنی قوم کے ایک ایک انسان تک اچھائی اور برائی کی پہچان کو پہنچانے کا کام زبردست طریقے سے انجام دیا۔

ختم نبوت امت پر ایک عظیم احسان

اس کے بعد ایک وقت آیا کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کے سلسلہ کو رحمت دو عالم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مکمل فرما دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا آپ کے بعد آنے والے انسانوں کو اچھائی یا برائی کا فرق سمجھانے کی ضرورت نہیں رہی؟ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ ضرورت ذرا بھی کم نہیں ہوئی، وہ تو آبادی کے بڑھنے کے لحاظ سے اور فتنوں کے بڑھنے کے لحاظ سے بڑھتی ہی چلی جارہی ہے، پھر کیوں اللہ تعالیٰ نے نبوت کے سلسلہ کو بند کر دیا؟

سچی بات یہ ہے کہ اللہ نے امت پر بہت بڑا کرم کیا کہ نبوت کے سلسلہ کو بند کر دیا۔ ایک یہودی عالم نے مدینہ منورہ میں جب یہ سنا کہ مسلمانوں پر یہ آیت اتری ہے: ''اَلْیَوْمَ أَکْمَلْتُ لَکُمْ دِینَکُمْ وَ أَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِی'' کہ آج ہم نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور اپنے احسان کو بھی تمام کر دیا۔ تو اس یہودی عالم نے اپنے لوگوں کے درمیان کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر اتری ہوتی تو اس دن تو ہم تیوہار مناتے، جشن مناتے، حضرت عمرؓ تک یہ بات پہنچی، انھوں نے اس شخص کو بلوایا اور پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ نے اس طرح کی بات کہی ہے، تو انھوں نے کہا کہ ہاں میں نے کہی ہے، تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ پہلی تو بات یہ ہے کہ شاید آپ کے ذہن میں یہ نہیں ہے کہ یہ آیت تو اتری ہے حج کے دن یعنی یوم عرفہ میں، اس سے بڑھ کر تو قیامت تلکوئی عید ہو ہی نہیں سکتی، اس دن ہمیشہ عید منائی جاتی رہے گی، لاکھوں لوگ میدان عرفات میں جمع ہو کر اللہ سے اپنا رابطہ جوڑیں گے اور اس نعمت پر شکر ادا کریں گے۔ لیکن آپ نے یہ بات جو کہی ہے اس کی ذرا اور تشریح تو کیجئے، تو انھوں نے کہا کہ عمر! ہم آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر چونکہ نبوت مکمل نہیں ہوئی اس لئے ہمیں ہر دور میں ہمیشہ یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ ہم پچھلے نبی کی بات کو مان رہے ہوں اور کسی اور گاؤں میں کوئی نیا نبی آچکا ہو اور ہم کو معلوم ہی نہ ہو، ہم یکسو نہیں ہو پاتے، ہر وقت ہم کو ایک اندیشہ لگا رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو اس سلسلے میں بالکل یکسو کر دیا کیونکہ اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں قیامت تک کوئی بھی شخص نبی بن کر کھڑا ہو، نبوت تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مکمل ہوگئی۔

ختم نبوت کے بعد انسانیت کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ کا غیبی نظام

نبوت کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک تو اللہ کی طرف سے اچھے برے کا علم لینا، اور ایک اس علم کو لوگوں تک پہنچانا، جب ہم کہتے ہیں کہ نبوت مکمل ہوگئی تو اس کا مطلب یہ کہ پہلا حصہ مکمل ہوگیا، یعنی اب اللہ کی طرف سے اچھے برے اور حق و باطل کا کوئی نیا علم کسی کے پاس نہیں آئے گا، لیکن اس کی ضرورت تو رہے گی کہ ہر کچے پکے گھر تک، ہر مرد اور عورت تک، ہر انسان تک اس اچھے اور برے کے علم کو پہنچایا جائے، کیونکہ اس امت کی لمبی عمر ہے اور پورا عالم اس کا میدان ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے ساتھ ایک خصوصی معاملہ کیا ہے کہ جس زمانے میں اس امت کو دین کی جس طرح کی محنت کی ضرورت پڑتی ہے اس زمانے میں اللہ تعالیٰ اس امت کو اسی طرح کی محنت عطا کر دیتے ہیں، اگر ایک وقت میں کئی طرح کی محنت کی ضرورت پڑتی ہے تو ایک وقت میں کئی طرح کی محنت بھی اللہ تعالیٰ اس امت کو عطا کر دیتے ہیں، اور اسی طرح کے اپنے شیدائی بندے اس کے لئے پیدا کر دیتے ہیں، ان کے اوپر اس محنت کو القاء کر دیتے ہیں، ان کے اندر اس محنت کا درد رکھ دیتے ہیں، جذب وجنون دے دیتے ہیں، شوق دے دیتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے امت کی وہ ضرورت پوری ہوجاتی ہے، یہ برکت ہے رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم نبوت کی، یہ ان کی دعاؤں کا صدقہ ہے، یہ اللہ کا خاص انتظام ہے، یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ یہ امت کبھی بھی سو فیصد گمراہ نہیں ہوگی، کبھی بھی ضائع نہیں ہوگی، اس میں سے افراد ضرور کچھ ادھر ادھر بہکیں گے، لیکن مجموعی طور پر پوری امت پچھلی قوموں کی طرح راستہ سے ہٹ جائے یہ ہرگز نہیں ہوگا، رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ امت کبھی عمومی گمراہی کا شکار نہیں ہوگی۔

رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب دنیا سے تشریف لے گئے تو اچانک کئی طرح کی محنتوں کی ضرورت پڑی، ایک ضرورت تو یہ پڑی کہ امت کو فتنوں سے اور ارتداد سے بچایا جائے، اللہ نے صدیق اکبرؓ کے دل میں اس کی ضرورت اور اس کا طریقہ ڈال کر اس ضرورت کو پورا کرا دیا۔

قرآن مجید کی آیات اور سورتیں الگ الگ جگہ پر لکھی ہوئی تھیں، امت کی شدید ضرورت تھی کہ یہ قرآن مجید اکٹھا ہو کر مرتب ہو، اور جس طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے لکھوایا تھا اسی طرح یہ مرتب ہو، یہ دین کی بہت بڑی محنت تھی، اللہ نے صدیق اکبرؓ کے دور میں وہ ضرورت پوری کروادی۔

قرآن مجید الگ الگ طریقے سے لکھا بھی جارہا تھا، الگ الگ طریقے سے پڑھا بھی جارہا تھا، یہ

بڑا زبردست علم ہے جو علماء علوم قرآن وتفسیر پر ریسرچ کرتے ہیں وہ اچھی جانتے ہیں کہ یہ بہت زبردست علم ہے کہ قرآن کس کس طرح لکھا جارہا تھا، کس کس طرح پڑھا جارہا تھا، دین کی محنت کی یہ ایک نئی ضرورت پیش آگئی، اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ قرآن کو اس طرح لکھا جائے کہ قرآن پورے عالم میں قیامت تک جب کہیں لکھا جائے تو اسی طرح سے لکھا جائے، جب کہیں پڑھا جائے اسی طریقے سے پڑھا جائے، ایک ایسے زمانے میں جس زمانے میں نہ چھپنے کا نظام تھا، نہ پرنٹنگ تھی، نہ ریکارڈنگ تھی، نہ جگہ جگہ سی ڈی باٹی جاسکتی تھی، نہ کیسٹ باٹی جاسکتی تھی، یہ آسان کام نہیں تھا، میں تو صرف اشارے کررہا ہوں، ورنہ یہ عجیب وغریب مضمون ہے، اللہ تعالیٰ نے سیدنا عثمان کے ذریعہ سے امت میں دین کی یہ محنت کروائی اور قیامت تک کے لئے یہ معجزہ ہوگیا، اب امریکہ میں قرآن چھپے، یا بیروت میں چھپے، یا ہندوستان میں چھپے، وہ اسی کے مطابق چھپے گا، مثلاً عباد کا لفظ جہاں پر قرآن میں ع ب اور الف کے ساتھ لکھا گیا وہاں پر پوری دنیا میں قرآن جہاں بھی چھپے گا الف کے ساتھ لکھا جائے گا، اور جہاں پر باء پر کھڑا زبر لگا کر لکھا گیا ہے وہاں پر کھڑا زبر لگا کر لکھا جائے گا۔

پھر جب خلافت راشدہ آگے بڑھی، ملکوں پر حکومت ہوئی، نئے نئے مسائل، نئی نئی تہذیبیں، نئے نئے تمدن سامنے آئے، ہر چیز کا اندراج، ریکارڈ کا محفوظ رکھنا، جزیہ وخراج، قوموں کے درمیان معاہدے، ان سب چیزوں کی ضرورت پڑی، تو اس بات کی سخت ضرورت پڑی کہ قرآن اور حدیث سے احکام نکالے جائیں، یہ بہت بڑی دین کی محنت تھی، اس کے لئے اللہ نے کہیں امام مالک کو کھڑا کردیا، کہیں امام ابوحنیفہ کھڑے ہوگئے، کہیں امام شافعی کھڑے ہوگئے، کہیں امام احمد کھڑے ہوگئے، کہیں سفیان ثوری کھڑے ہوگئے، کہیں امام اوزاعی کھڑے ہوگئے، کہیں کوئی کھڑا ہوگیا کہیں کوئی کھڑا ہوگیا، وہ کام ہوا جو واللہ قومیں بھی نہیں کرسکتیں، اللہ پاک نے اس وقت ان لوگوں سے دین کی یہ محنت لی۔

ایک ضرورت اس بات کی پڑی کہ رحمت دوعالم ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے ارشادات، آپ کے ملفوظات، آپ کی حدیثیں، آپ کے واقعات، وغیرہ محفوظ ہوں، اللہ اکبر! جانتے ہیں کہ ایک حدیث کو جمع کرنے کے سلسلہ میں اس وقت کے محدثین کو کتنی زبردست محنت کرنی پڑی تھی، آج اگر پوری دنیا کے نئے پرانے سارے احباب مل جائیں تو بھی وہ محنت نہیں کرسکتے جو امام بخاری کرگئے، جو امام مسلم کرگئے، جو امام ترمذی کرگئے۔

یہ باتیں اس لئے بتا رہا ہوں تا کہ خاص طور سے ہمارے پرانے ساتھیوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھے کہ جس دور میں جس طرح کی دین کی محنت کی ضرورت پڑتی ہے اس طرح کی دین کی محنت اللہ اس امت میں چلا دیتے ہیں، دین کی محنت کسی ایک ہی طریقہ کا نام نہیں ہے، ایک ہی طریقہ پر دین کا کام ہو اس نام نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہم کس محنت کو کر سکتے ہیں، ہماری کیا اوقات ہے، ہماری کیا حیثیت ہے، لیکن دین کی محنتیں اس کے تقاضے ہر دور میں نئے نئے پیش آئے، ہر دور میں نئی نئی ضرورتیں پڑیں اور اللہ نے ہر دور میں اس انداز کی دین کی محنت اس امت کو عطا کی۔

چودھویں صدی کے حالات اور تقاضے

اب میں درمیان کی پوری تاریخ حذف کر کے اپنے دور میں آتا ہوں، ہمارے دور میں کیا ہوا؟ پچھلی صدی میں یا چودھویں صدی میں کیا نئے حالات امت کو درپیش ہوئے، اشاروں کو ذرا اچھی طرح سمجھئے گا، کیونکہ مسئلہ معلومات میں اضافے کا نہیں ہے، مسئلہ جان و مال کی قربانی کا ہے، مسئلہ عمل اور محنت کا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ہم ٹھیک سے سمجھیں، تا کہ نہ تو ہم احساس کمتری میں مبتلا ہوں، کہ کوئی شخص آئے اور کھینچ کے کسی اور طرف لے کے چلا جائے، اور نہ ہم غلو میں مبتلا ہو کر یہ کہیں کہ صرف یہی دین کا کام ہے باقی کوئی کام ہی نہیں۔ چنانچہ پچھلی صدی میں کیا نیا واقعہ ہوا اس کو ذرا غور سے سنیں، اس امت میں کچھ لوگ اللہ سے غافل ہو جائیں، کچھ لوگ گناہوں میں مبتلا ہو جائیں، یہ تو ہر دور میں ہوا ہے، لیکن یہ بات کہ ساری دنیا میں ایسی غفلت طاری ہو کہ جب تک پچاسوں بار جھنجھوڑا نہ جائے کسی کو اللہ یاد ہی نہ آئے، کسی کو آخرت یاد ہی نہ آئے، کسی کو اپنی موت یاد ہی نہ آئے، میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کی یہ حالات امت میں کبھی نہیں آئے تھے، یہ اصل میں نحوست ہے یورپ کی، مغرب کی، یاجوج اور ماجوج کی، فتنۂ دجال کی، یہ اس کا نتیجہ ہے، کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ پوری دنیا کے اکثر مسلمانوں کا یہ حال ہو جائے کہ پیدا ہونے کے بعد سے مرنے تک کبھی اللہ یاد ہی نہ آئے، ہوتا یہ تھا کہ کسی کو تو شروع ہی سے دینی تربیت مل جاتی تھی، اکثر تو ایسے ہی ہوتے تھے، کسی کو تھوڑے دن کچھ دو چار غلطیاں کرنے کے بعد ہوش آتا تھا، وہ توبہ کر لیتے تھے، اپنے کو بنا لیتے تھے، قدم قدم پر اللہ والے بیٹھے ہوئے تھے، قدم قدم پر اصلاح کے مرکز قائم تھے اور لوگ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں جاگ ہی جاتے تھے، ایسی بے طلبی کا عالم اور ایسی بے فکری کا عالم کبھی امت پر نہیں آیا تھا، پچھلی صدی میں انگریزوں کے پوری دنیا میں چھا جانے کے بعد ایک مخصوص کلچر دنیا میں چلا،

ایک خاص مصیبت دنیا پر آئی، ایسے لوگوں کی تہذیب دنیا پر چھا گئی جو انسان کو حیوان مانتے ہیں، غور کریں کہ اللہ کہتا ہے کہ انسان میرا خلیفہ ہے، اور یہ کہتے ہیں کہ انسان بندر کی اولاد ہے، فرق دیکھئے دونوں APPROACH میں، ایک فلسفہ، ایک تہذیب، ایک کلچر، ایک تمدن، ایک کی سوشالوجی، ایک کی بایولوجی یہ کہتی ہے کہ انسان بندر کی اولاد ہے، اور ایک کی آسمانی کتاب کہتی ہے کہ انسان اللہ کا خلیفہ ہے، اللہ کا نائب ہے، اللہ کا ڈپٹی ہے، اللہ نے اپنا نمائندہ بنا کر اس کو زمین پر بھیجا ہے، یہ کتنا اونچا STATUS انسان کو دیتا ہے، کہ اللہ کے بعد انسان ہی انسان ہے یعنی اللہ کے بعد انسان سے بڑا کوئی نہیں ہے، سورج بھی انسان سے چھوٹا، چاند بھی انسان سے چھوٹا، پہاڑ بھی انسان سے چھوٹے، فرشتے بھی انسان سے چھوٹے، ہوائیں بھی انسان سے چھوٹیں، کوئی انسان فرشتوں کے لئے نہیں بنایا گیا، سارے فرشتے انسانوں کے لئے بنائے گئے ہیں، تبھی تو اللہ نے انسان سے کہا کہ دیکھو تم دنیا میں سب سے بڑے ہو اور میں تم سے بھی بڑا چونکہ تم دنیا میں سب سے بڑے ہو لہٰذا تم بار بار اللہ اکبر اللہ اکبر کہتے بھی رہنا سنتے بھی رہنا، اس لئے کہ جب تم سب چھوٹوں کے بیچ میں رہو گے تو کہیں تم اپنے آپ کو مجھ سے بڑا نہ سمجھنے لگو، یاد کرتے رہنا کہ ان سب سے تو میں بڑا ہوں لیکن اللہ سے چھوٹا ہوں، اللہ بہت بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔

ایک ولی صفت بادشاہ

واقعی یہ حال تاریخ اسلامی میں کبھی نہیں پیش آیا میں بیجاپور میں بیٹھ کر یہ بات کہہ رہا ہوں جس کی اپنی ایک تاریخ ہے ولایت کی بھی اور بادشاہی کی بھی، سرزمین بیجاپور میں تو اولیاء اللہ کے خزانے دفن ہیں، آپ تو گھر میں بیٹھے ہوئے یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہر چند فرلانگ کے فاصلے پر کیا آپ کے یہاں قطب اور ابدال دفن نہیں ہیں، کیا آپ کے یہاں چوٹی کے اولیاء اللہ مدفون نہیں ہیں، یہ اولیاء اللہ کیا کرتے تھے، یہ سب اولیاء اللہ مرکز اصلاح چلاتے تھے، پچھلے زمانے میں بادشاہ بھی اللہ کے ولی ہوا کرتے تھے، آپ نے وہ واقعہ نہیں سنا کہ جب خواجہ بختیار کعکیؒ کا انتقال ہوا ہے، جو اتنا بڑا ولی تھا، قطب الاقطاب تھا، کتنا عظیم انسان تھا، جب حضرت خواجہ بختیار کعکیؒ کا انتقال ہوا تو اس وقت ان کی نماز جنازہ میں بڑی دیر لگی، سلطان شمس الدین التمش اس وقت ہندوستان کا بادشاہ تھا اور وہ حضرت خواجہ بختیار کعکیؒ کے بہت ہی چہیتے مرید تھے، بہت ہی معتمد تھے، کئی گھنٹے ہو گئے نماز جنازہ شروع ہی نہیں ہو رہی ہے، تو سلطان نے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے، نماز میں کیوں دیر ہو رہی ہے؟ تو لوگوں نے بتایا کہ حضرت! مسئلہ یہ ہو گیا کہ انھوں نے ایک

ایسی وصیت کردی تھی کہ میری نماز جنازہ وہ پڑھائے جس کی بالغ ہونے کے بعد سے آج کے دن تک زندگی میں کبھی بھی تہجد نہ چھوٹی ہو، جس کی عصر کی نماز سے پہلے کی سنتیں کبھی نہ چھوٹی ہوں، اور جس کی کبھی نگاہ نامحرم پر نہ پڑی ہو، وہ میری نماز پڑھائے، اب بڑے بڑے مشائخ اور علماء اور خلفاء کے پاس ہم لوگ جارہے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ آپ نماز پڑھادیجئے امید ہے کہ آپ کے اندر یہ شرطیں پائی جاتی ہوں گی، تو وہ سر جھکا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ بالغ ہونے کے بعد سے آج تک میری ایک دن بھی تہجد نہیں چھوٹی، تو بڑے اولیاء اللہ معذرت کررہے ہیں، اس لئے دیر لگ رہی ہے تھوڑی دیر اور انتظار کیا گیا، پھر بادشاہ نے پوچھوایا، بتایا گیا کہ حضرت کوئی تیار ہی نہیں ہورہا ہے، سب کہہ رہے ہیں کہ ہم اس CRITERIA پر پورے نہیں اترتے، ہم کیسے پڑھادیں، تب سلطان شمس الدین نے اپنا سر جھکایا اور رومال سے اپنا چہرہ چھپایا اور ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے اور کہا: چلو نماز جنازہ تیار کرو اب یہ ان کا غلام ہی پڑھائے گا، اور ان کے جنازے کے سامنے کھڑے ہوکے کہا کہ حضرت! آپ نے اپنے غلام کے راز کو فاش کردیا، تب دنیا کو پتہ چلا کہ ہندوستان کا بادشاہ اتنا بڑا ولی تھا کہ بالغ ہونے کے بعد سے اس دن تک اس کی تہجد نہیں چھوٹی۔ تو جس زمانے میں بادشاہ اور امراء ایسے ہوتے تھے اس زمانے میں عام لوگ کیسے ہوتے ہوں گے۔

ایک خاص قسم کی دینی محنت کی ضرورت

وہ بہت خیر کا زمانہ تھا، یہ نحوست جو آئی ہے، یہ عریانیت، یہ بے حیائی، یہ اولاد کا ماں باپ کو بدتمیزی سے جواب دینا، یہ بے ادبی، یہ بے احترامی، یہ پڑوسیوں کے ساتھ بدسلوکی، یہ بے ایمانی، یہ رشوت، یہ سود، یہ بات بات پہ گولی کا چلنا، یہ سب مغرب سے چل کر پوری دنیا میں چھا جانے والی مادہ پرست ذہنیت کی نحوست ہے، ہر طرف بے ایمانی کی آگ لگ گئی، بستیوں کی بستیوں میں کوئی حیاء دار نوجوان نہیں ملتا کہ جس کے دامن پر کوئی دھبہ نہ لگا ہو، لوگ نمازوں سے بے رغبت ہوگئے، لوگ علم سے بے رغبت ہوگئے، ذکر سے بے رغبت ہوگئے، لوگ قرآن کی تلاوت سے بے رغبت ہوگئے، بس پیٹ اور شرمگاہ، انسانوں کے یہ دو قبلے بن گئے، جس طرح گدھا ہوتا ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا سوائے پیٹ اور شرمگاہ کے، انسانوں کے دماغ پر بس پیٹ اور شرمگاہ کی پوجا چھا گئی اور تمام انسان اسی فکر میں پاگل ہونے لگے، بھول گئے لوگ کہ کیا ہوتی ہے اللہ کی محبت، کیا ہوتی ہے اللہ کی یاد، کیا ہوتی ہے تہجد، کیا ہوتا ہے سجدہ، کیا ہوتا ہے رکوع، کیا ہوتی ہے تقوے کی لذت، جب یہ دور آیا تو امت کی ضرورت بدل گئی، اس سے پہلے تک تو لوگوں میں بہت طلب ہوتی تھی

اور جہاں طلب ہوئی کسی نہ کسی اللہ والے کے پاس پہنچ گئے کہ حضرت! تقوی سکھادیجئے، حضرت توکل سکھادیجئے، حضرت نماز سکھادیجئے، حضرت قرآن سن لیجئے، حضرت علم وذکر سکھادیجئے، ہر خانقاہ ایک بہت بڑا مرکز ہوا کرتی تھی اور خالی لوگ آتے نہیں تھے بلکہ یہ اللہ والے تربیت دے کر سارے علاقوں کے اندر اپنے خلفاء کو بھیجا کرتے تھے۔

جب ایسی شدید بے طلبی اور ایمان واسلام کی بے وقعتی عام ہوگئی، تو اللہ نے اپنے اچھے اور مقبول بندوں کی جماعت میں سے ایک کو خاص طور پر اس طرف متوجہ کردیا کہ وہ ایسی اجتماعی اور عمومی محنت کھڑی کرے کہ ایک ایک بے طلب امتی کے پاس بے غرض بن کر جانے اور اس کے اندر دین کی عظمت اور دین کی طلب پیدا کرنا آسان ہوجائے۔

تبلیغ کی محنت کیا ہے؟

یہ اصل میں بے غرض بن کر بے طلب بندوں میں جانا اور ان کے اندر دین کی طلب پیدا کرنا یہی اس کا خاص کام ہے، یہی اس کا مشن ہے، پہلے اس بات کی ضرورت نہیں تھی کہ دروازے دروازے جایا جائے، ایک ایک دوکان پہ دستک دی جائے، ایک ایک بندے کی خوشامد کی جائے، اس لئے کہ لوگوں میں خود طلب تھی، وہ خود سیکھتے تھے، وہ خود تلاش کرتے تھے، لیکن جب دور بدل گیا تو اللہ کا کرم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دور میں ایسی محنت عطا کردی کہ جس میں تمام بے طلبوں کے پاس جانا آسان ہوجائے۔ پوری دنیا میں امت کے جو حالات تھے اور ہیں، اللہ کی قسم اگر یہ عمومی محنت نہ چلی ہوتی تو اللہ جانے کیا حشر ہوتا، اتنی محنت کے باوجود بھی آج امت میں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں ایسے مسلمان ہیں کہ جن کو کچھ فکر نہیں ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا، جنھیں کچھ پتہ ہی نہیں ہے کچھ خبر ہی نہیں ہے، ایسے ملک کے ملک پڑے ہوئے ہیں جن تک ابھی تک دین کی طلب پیدا کرنے والی دعوت نہیں پہنچی، جب کہ کتنی جماعتیں نکل چکیں تو کام ہوا بھی ہے بہت، لیکن ابھی ہونا بہت باقی ہے۔

دعوت وتبلیغ کا اصل مزاج

اس محنت کی ترتیب بھی عجیب ہے، کہ دیکھو یہ مت سمجھنا کہ تم ان کو دین سکھانے کے لئے جارہے ہو، تم یہ نیت کرنا کہ ہم اپنی اصلاح کے لئے جارہے ہیں، ہم تو خود دین سیکھنے کے لئے جارہے ہیں، اگر یہ نیت کرتے رہوگے تو تمہارے اندر تواضع رہے گی، تم جڑوگے بھی اور جوڑوگے بھی، تم الگ سے کوئی فرقہ نہیں

بنو گے، تمہارے اندر غرور نہیں آئے گا، تم یہ نہیں کہو گے کہ یہی دین کی ایک محنت ہے، تم دین کی ان ساری محنتوں کو اپنے سر آنکھوں پر رکھو گے، ان کی قدر کرو گے، تم رشک کی نگاہ سے دیکھو گے کہ یہ علماء ہیں، یہ بخاری پڑھاتے ہیں، یہ مسلم پڑھاتے ہیں، یہ تفسیر اور قرآن پڑھاتے ہیں، ہم کہاں اس درجہ کے ہیں، یہ تو بہت بڑے لوگ ہیں، ہم تو ان کے غلاموں کے غلام بھی بننے کے لائق نہیں ہیں، ہم نے تو بہت ہوا تو پندرہ بیس منٹ فضائل اعمال کی یا منتخب احادیث کی تعلیم کر لی، ہماری یہ سطح ہے، ان کی وہ سطح ہے، تم کبھی علماء کو حقیر نہیں سمجھو گے۔

اس دعوت کی محنت میں جن پرانوں کو ہم نے بچپن میں دیکھا تھا وہ ایسے ہوتے تھے کہ وہ اپنے کو انتہائی معمولی ٹوٹا پھوٹا انسان سمجھتے تھے، اور علماء کو، مدرسوں کو اور خانقاہوں کو بہت عظمت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کے دل میں کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ ہم ہی دین کا کام کر رہے ہیں، یہ لوگ دین کا کام نہیں کر رہے ہیں۔ جب بچپن میں ندوہ میں داخل ہوا، اس وقت ۹ سال کی میری عمر تھی، تو شروع شروع میں ایک صاحب کو دیکھتا تھا جو پیروں سے اور دونوں ٹانگوں سے معذور تھے، اور ایک لکڑی کی ایک تختی میں انھوں نے پہیے لگا لئے تھے جیسے معذور لوگ بنا لیتے ہیں، اسی معذوری کی حالت میں وہ گھسٹتے ہوئے جماعتوں میں نکلتے تھے، جس کے نتیجے میں ان کے اندر اتنی عظمت آ گئی تھی کہ ہمارے شہر کا جو سب سے بڑا دارالعلوم ندوۃ العلماء ہے، اس کے گھر سے ندوہ کی عمارت تین میل دور تھی، وہ بندۂ خدا گھسٹتا گھسٹتا وہاں تک روزانہ صبح فجر کے بعد جاتا تھا اور کافی دیر تک وہ ندوہ کی عمارت کو دیکھتا رہتا تھا، ندوہ کے جو طلبہ باہر ٹہلنے کے لئے نکلتے تھے، وہ ان کو بھی دیکھتا رہتا تھا اور چپ چاپ واپس چلا جاتا تھا، کئی دن تک لگاتار کچھ اساتذہ یا طلبہ نے دیکھا تو معہد ثانوی کے صدر مدرس صاحب سے کہا کہ حضرت! ایک معذور سا بندہ ہے، آ کے روزانہ یہاں کھڑا ہوتا ہے، ہم لوگ سلام بھی کرتے ہیں، خیریت بھی پوچھتے ہیں، بہت اچھی طرح جواب بھی دیتا ہے، ہم کہتے ہیں بھائی کوئی ضرورت ہے؟ کہتا ہے نہیں نہیں کوئی ضرورت نہیں، ماشاء اللہ میں کماتا ہوں، کچھ بتاتا ہی نہیں کہ وہ کیوں آتا ہے، تو ہمارے صدر مدرس صاحب نے کہا تم نے بہت اچھا کیا کہ مجھے بتا دیا، اگلے دن صبح فجر بعد وہ خود باہر آئے اور آ کر اس کے پاس بیٹھ گئے، سلام کے بعد پوچھا بھائی! تمہارا کیا نام ہے؟ بتایا میرا یہ نام ہے، پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو؟ کہا حضرت! میرے ہاتھ تو بالکل ٹھیک ہیں، پیروں میں معذوری ہے، میں دن بھر لفافے بنا کر بیچتا ہوں، پانچ روپئے مجھے دن میں ملتے ہیں جو میرے لئے کافی ہو جاتے

ہیں، پھر پوچھا کہ بیٹا تم یہاں پر کیوں آتے ہو؟ تمہیں کچھ مدد کی ضرورت ہے؟ کوئی خدمت ہے؟ ہم بڑے گنہگار ہوتے ہیں کہ تم آتے ہو اور چلے جاتے ہو، کہا کہ نہیں حضرت، ہم اس لئے نہیں آتے، پوچھا کہ بیٹے تو کیوں آتے ہو، اس نے کہا کہ حضرت یہ نہ پوچھئے، انھوں نے کہا نہیں اب تم کو نہیں جانے دیں گے، بتاؤ تم کیوں آتے ہو، تب اس نے کہا کہ حضرت! میں جاہل آدمی ہوں، تین تین دن کے لئے جماعت میں نکلتا ہوں، کچھ کلمہ نماز درست کر رہا ہوں، اب میں اور کچھ تو نہیں کر سکتا، نہ میں مدرسہ کو پیسہ دے سکتا ہوں، نہ میں تندرست ہوں کہ اس کی کچھ خدمت کر سکوں، میں روزانہ صبح آکر یہاں بیٹھ کر بس یہ دیکھتا ہوں کہ یا اللہ! یہ کتنی عظیم عمارت ہے، اس کے اندر حدیث پڑھائی جارہی ہے، اس میں قرآن پڑھایا جارہا ہے، اس میں کتنا قال اللہ اور قال الرسول ہو رہا ہے، مجھے رشک آرہا ہے، میں آپ سب کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ ان بچوں کو ولی بنادے، اللہ ان بچوں کو ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنادے، اور حضرت! میرا نصیب کیا ہے، میں تو بہت کم پڑھا لکھا معمولی آدمی ہوں، اس لئے میں بس آکے اس طرح چلا جاتا ہوں، کیونکہ میں نے بزرگوں سے بیان میں سنا کہ بھائی اگر تم ان کی کوئی خدمت نہ کر سکو تو ان علماء کو محبت سے دیکھ ہی لیا کرو، یہ علماء نبیوں کے وارث ہوتے ہیں، تو میں دیکھنے چلا آتا ہوں۔

ہمارے صدر مدرس صاحب پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ دن بھر روتے رہے، اور ایک ہی جگہ پر میرے والد صاحب اور حضرت مولانا علی میاں رہتے تھے، وہاں عصر بعد شام کو وہ آئے اور آکر یہ واقعہ سنایا، اور خود بھی روئے اور سب حاضرین کو بھی رلایا۔ سچی بات ہے کہ یہ ہے وہ مزاج جو تبلیغ کی یہ محنت ہر عام مسلمان کا بنانا چاہتی ہے۔

ہماری بے اصولیاں کہیں بگاڑ کا سبب نہ بن جائیں!

میرے پیارے دوستو! یہ بہت عظیم نعمت ہے، کہیں ہماری وجہ سے یہ بگڑ نہ جائے، کہیں ہماری بے اصولی اور ہماری بے ادبی کی وجہ سے اس پر دھبہ نہ لگ جائے، پھر اللہ تعالیٰ ہم کو کیا سزا دیں گے ہم نہیں کچھ کہہ سکتے، تم سے یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ اس محنت کی عزت بڑھاؤ تو تم نے ایسا کیوں کیا کہ اس محنت کو لوگ برا بھلا کہنے لگے، اس محنت سے لوگ بدگمان ہونے لگے، تمہارے دل میں یہ خیال کیسے آیا کہ دین کی یہی ایک محنت ہوتی ہے، کیا کبھی حضرت مولانا الیاسؒ نے کہا تھا کہ دین کی یہی ایک محنت ہے؟ ذرا اپنے دل کو ٹٹولیں، علماء کے بارے میں، مدرسوں اور مکتبوں میں پڑھنے پڑھانے والوں کے بارے میں اور دین

اورامت کی خدمت کے دوسرے شعبوں میں لگے ہوئے حضرات کے بارے میں ہمارے دلوں کے اندر کس قسم کے جذبات ہیں؟

علم اور ذکر، دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے

اس لئے اس بات کو خوب دھیان سے سمجھیں کہ ہر دور میں جس طریقے کی محنت کی ضرورت پڑتی ہے اللہ اس طریقے کی محنت اس امت کو عطا کر دیتے ہیں، جب علم کی ضرورت پڑی تو اللہ نے علم کی محنت چلائی، جب ذکر کی محنت کی ضرورت پڑی تو اللہ نے ذکر کی محنت چلادی، جب عمومی انداز سے علم وذکر دونوں کی محنتوں کی ضرورت پڑی تو اللہ تعالیٰ نے یہ چلادی، آپ کیوں نہیں اس بات پر غور کرتے کہ ۶ نمبروں میں علم وذکر کو الگ الگ نمبر نہیں دیا گیا، اگر اخلاص الگ ہوسکتا ہے، اکرامِ مسلم الگ ہوسکتا ہے، ایمان ویقین الگ ہوسکتا ہے تو علم الگ ہوجاتا، ذکر الگ ہوجاتا تو اور اچھا تھا کہ ۶ نمبر کے بجائے ۷ نمبر ہوتے، طاق عدد ہوتا، مگر میں سلام بھیجتا ہوں حضرت مولانا الیاسؒ کے تفقہ فی الدین پر، انھوں نے ایک منٹ کے لئے گوارا نہیں کیا کہ علم وذکر الگ الگ کر دیا جائے، اس لئے کہ وہ خوب جانتے تھے کہ علم بغیر ذکر کے یہودیت ہے اور ذکر بغیر علم کے نصرانیت ہے، جب کوئی ذکر تو کرتا ہے مگر علم نہیں سیکھتا تو اس کے اندر بدعات آتی ہیں، پھر وہ پیر پرست ہوتا ہے، پھر وہ صاحبزادہ پرست ہوتا ہے، جیسے عیسائی لوگ بن گئے، اور جب علم ہو اور ذکر نہ ہو تو تکبر آتا ہے، غرور آتا ہے، حسد آتا ہے، باطنی امراض پیدا ہوتے ہیں، جیسے یہودیوں میں پیدا ہوئے۔ اللہ پاک نے عجیب وغریب نصاب دیا ہے کہ علم بھی سیکھنا ہے، ذکر بھی سیکھنا ہے، علم میں بھی آگے بڑھنا ہے، ذکر میں بھی آگے بڑھنا ہے۔

بعض وقت ہمارے احباب سے بڑی غلطی ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اور نکلنے کے زمانے میں بھی انفرادی اعمال کا اہتمام نہیں کر پاتے، لوگو! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں جو اللہ کے بندے دین کی محنت کر رہے ہیں اگر وہ انفرادی معمولات کی پابندی بھی کرلیں تو وہ خود دیکھیں گے کہ ان کے دل میں کیا چمک پیدا ہوگئی، یہ عجیب شیطان کا وسوسہ ہے کہ نکلنے کے زمانے میں بھی تسبیحات ٹھیک سے نہیں پڑھتے، کبھی گشت کے درمیان پڑھ لیا، خدمت کے درمیان پڑھ لیا، تعلیم کے حلقے میں بیٹھ کے پڑھ لیا، نہیں ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے، یہ تین تسبیحات صبح وشام جو اس کام میں نکلنے کے درمیان بھی اور اپنے مقام پر بھی جو بتائی جاتی ہیں اس میں سخت تاکید ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر استحضار کے ساتھ تسبیحات پڑھو، آپ جب الحمدللہ

کہتے ہیں تو اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں، آپ جب کسی کا شکریہ ادا کرتے ہیں تو کس طرح کرتے ہیں؟ اس طرح کہ اخبار پڑھ رہے ہوں، فون پہ باتیں بھی کر رہے ہوں اور شکریہ بھی ادا کر رہے ہوں؟ اگر آپ اس طرح سے کریں گے تو لوگ آپ کو دماغی اسپتال میں پہنچادیں گے کہ دماغ خراب ہوگیا ہے، خدا کے لئے ذرا سوچیں ہم اللہ کا شکر ادا کر رہے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ خیال کہیں اور لگا ہوا ہے، یہ تین تسبیحات تنہائی میں بیٹھ کر، نکلنے کے زمانے میں مسجد میں تنہائی میں بیٹھ کر، اور اپنے مقام پر مسجد میں یا گھر میں بالکل تنہائی میں بیٹھ کر دھیان کے ساتھ پڑھیں تب انشاء اللہ ذکر کا فائدہ ہوگا۔ اللہ پاک اس کام کی اور اس محنت کی قدر کی توفیق عطا فرمائیں۔ اللہ تعالی اس کام کو ہمیشہ قیامت تک اسی مزاج کے ساتھ چلائے، اللہ سب کو ثابت قدم رکھے، ہم سب کو شکر کی توفیق نصیب فرمائے، آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ آپ کے یہاں اجتماع ہونے والا ہے، یہ اجتماع کے موقعے ایسے ہوتے ہیں کہ نئے اور پرانوں کا سارا مجمع اگر اس موقع کی قدر کرلے اور اس کا اس اجتماع کی محنت میں حصہ لگ جائے تو اس اجتماع سے جو خیر پھیلے گا، اجتماع سے پہلے یا اجتماع کے دوران یا اجتماع کے بعد، وہ سارا خیر آپ میں سے ایک ایک کے نامۂ اعمال میں آئے گا۔

یہ اجتماعات اس لئے رکھے جاتے ہیں کہ نیا نیا مجمع جڑے، ہمارے اندر نیا جوش آئے، ہم خود سے اپنی جان و مال قربان کریں، خوب لگن کے ساتھ لگیں، اس لئے وقت کم ہے، میں بہت محبت کے ساتھ آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ پورا مجمع اسی نشست میں ابھی خوب ہمت اور قوت کے ساتھ اپنے ناموں کا اظہار کریں، اپنے اپنے نام لکھوائیں، مسجد وار جماعت کے اعتبار سے بھی لکھوائیے، نقد اپنے ناموں کو پیش کیجئے اور اس کے علاوہ جو اجتماع سے نکلنے والی جماعتیں ہیں اس کے لحاظ سے بھی پیش کیجئے، اجتماع سے پہلے کا جو ٹارگیٹ ہے اس کو پہلے پورا کیجئے پھر اجتماع کے بعد کا پورا کیجئے۔

(بیان کے بعد دیر تک تشکیل کا سلسلہ چلا، اس کے بعد دعا پر مجلس کا اختتام ہوا۔)

☆☆☆

مولانا ابوحسان پوترک ☆

اولاد کی ترقی کا خواب

یہ بات بالکل سچ اور حقیقت ہے کہ والدین اپنی اولاد کو مثالی انسان بنانا چاہتے ہیں، پورا شعور اور سلیقہ نہ ہونے کے باوجود زندگی کے ہر میدان میں وہ اپنی اولاد کو سب سے نمایاں، منفرد اور بلند دیکھنے کی شدید آرزو رکھتے ہیں، علم واخلاق، شہرت وعزت ہو یا دولت ووجاہت ہر چیز میں ممتاز اور نمایاں شان کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ادنی مصالحت کے روادار نہیں ہوتے، بلکہ مسابقت اور مقابلہ کے ایسے دور میں جہاں ہر آدمی آگے بڑھنے کے لئے دوسروں کو گرانا ضروری سمجھتا ہے صرف والدین ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اپنے سے بھی آگے اور مقام عظمت کے آخری سرے پر دیکھنے کا خواب سجاتے ہیں۔

مگر والدین کا یہ خواب اکثر ادھورا ہی رہ جاتا ہے۔ دراصل زندگی جد وجہد اور سرگرمی کا نام ہے۔ یہاں صحیح تدبیر، موافق ومعقول کوشش، حرکت وعمل کی مخصوص مقدار ہی سے نتائج پیدا کئے جاتے ہیں۔ صرف تمناؤں اور آرزوؤں کی رومانیت سے یہاں کسی کو کچھ نہیں ملتا۔ اس لئے اولاد کی بے مثال ترقی کا خواب بھی کچھ عقلی اور عملی کوششوں ہی سے شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔

بچے کی مثال ننھے پودے کی طرح ہے ایک پودا اسی وقت طاقتور اور توانا، ثمر آور اور نفع بخش درخت بنتا ہے جب اس کی نشونما اور حفاظت کے لئے دسیوں طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، اچھی زمین، مناسب ماحول، روشنی اور توانائی کا انتظام، کھاد اور پانی کے بندوبست کے ساتھ موسمی اور وبائی جراثیم سے بچاؤ، دیکھ ریکھ، کٹائی چھنٹائی کے لئے ماہر اور سخت کوش مالی مقرر کیا جاتا ہے، تب جا کر وہ پودا تناور درخت بنتا ہے، جس کے پھلوں، پتوں اور سایہ سے مالک کے علاوہ دوسرے انسان اور جانور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

قرآن کی شہادت کے مطابق اللہ تعالی نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے، اور حدیث نبوی کا

☆ ناظر معہد الامام ولی اللہ الدھلوی للدراسات الاسلامیہ

ارشاد بھی یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اور فطرت توازن واعتدال سے معنون ہے، یعنی نفس انسانی کی پیدائشی خوبیوں اور اس کی طبعی کمزوریوں کے درمیان ایسا اعتدال قائم کیا جائے جو اس کو حیوانی خصلتوں اور شیطانی شرارتوں سے محفوظ کردے۔ اس اعتدال کو پیدا کرنے میں تعلیم وتربیت سے مدد حاصل کی جاتی ہے۔

تعلیم وتربیت کا لفظ جب ہمارے کانوں سے ٹکراتا ہے تو ذہن اسکول اور مدرسہ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، حالانکہ انسانی بچہ کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ اس کی پیدائش سے بھی پہلے شروع ہو چکا ہوتا ہے، حدیث میں گہوارے سے لحد تک علم کی تحصیل کا وقت بتایا گیا ہے، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ انسان ہر وقت کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے، رسمی تعلیم کے مرحلہ سے نہ بھی گزرا ہو تو گھر، خاندان، سماج اور اس میں پائے جانے والے ماحول سے خود بخود سیکھتا رہتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے بچہ کی آموزش کا دور ماں کے پیٹ میں قرار پانے والے نطفہ سے بھی پہلے شروع ہوتا ہے نکاح کے وقت زوجین میں حسن کردار اور اسلامی قدروں کی اہمیت بچہ کی کامیاب زندگی میں غیر معمولی تاثیر ہی کی وجہ سے ہے، جدید تحقیقات نے بھی اس بات کی تصدیق کردی ہے کہ ماں باپ کی اپنی تربیت، ان کے جذبات وخواہشات ان کے علم وذہانت کا اثر براہِ راست اولاد پر ہوتا ہے، اس لئے مثالی اور باکردار اولاد کی آرزو کے حوالے سے باپ کے اقدام نکاح اور بیوی کے انتخاب کا مرحلہ انتہائی نازک اور اہم ہے۔ کیونکہ وہ صرف خوبصورت بیوی کا انتخاب نہیں کرتا بلکہ اپنی نسل کے روشن یا تاریک مستقبل کی بنیاد ڈالتا ہے۔

چنانچہ نکاح کے سلسلہ میں مرد کو دیندار عورت کے انتخاب کی بے پناہ ترغیب دی گئی ہے۔ مگر دینداری کا موجودہ معیار محض صوم وصلاۃ کی پابندی سے معنون ہے جو ناقص اور ناکافی ہے۔ دینداری کا مفہوم اپنی وسعت کے اعتبار سے پورے دین کو شامل ہے، خصوصا دور جدید کے بدلے ہوئے حالات میں اسلامی اعتقادات اور نظریات کی من مانی تشریحات، تہذیب ومعاشرت کی کش مکش، مکارم اخلاق اور حسن تعامل کی غیر اسلامی قدروں کا عمومی چلن، نسوانی تشخص اور صنفی خصوصیات کے فقدان، گھریلو اور خاندانی نظام کے انتشار، سادگی، شائستگی اور سلیقہ مندی کی معدومی نے دینداری کے معیار کو بے حد پیچیدہ بنا دیا ہے۔

جو عورت، ماں بن کر پوری نسل کی تشکیل کا کام انجام دینے والی ہے اور جس کے ذہنی، مزاجی اور عملی رجحانات کا اثر بچہ کی طبیعت اور مزاج پر پڑنے والا ہے، اور خصوصا ایام حمل ورضاعت میں اس کی خوش

مزاجی، مثبت اور اچھی سوچ، نیک اور پاکیزہ اعمال بچہ کی فطری اور ارادی افکار و اعمال کی بنیاد قائم کرتے ہیں اس کا سرسری انتخاب یقیناً باپ کے لئے قتل اولاد کی معصیت کا ارتکاب ہے۔ پھر عورت کو اس حقیقت سے واقف ہونا چاہئے کہ اس کی حیثیت بیوی ہونے کے ساتھ ماں کی بھی ہے، ماں کا کردار اولاد کی تربیت اور اخلاق سازی میں باپ سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اسے اپنے اولاد کے استقبال کے لئے ہمیشہ تیار رہنا چاہئے، اسکے نقش قدم پر چل کر ہی اولاد جنت کے دروازے تک پہنچ سکتی ہے، اور باپ اس کے دروازے پر اس کا استقبال کرتا ہے۔ اس لئے اسلامی تعلیمات میں اولاد کی جنت، ماں کے قدموں تلے اور باپ کو باب بہشت بتایا گیا ہے۔

دوران حمل عورت کی قلبی کیفیات کے سلسلہ میں جدید تحقیقات نے تسلیم کیا ہے کہ ماں کو اس زمانے میں اطمینان وسکون کی ضرورت معمولی حالات سے زیادہ ہوتی ہے، ذہنی دباؤ، قلبی تشویش، عملی انتشار و پریشانی اور جھنجھلاہٹ وغصہ جسم کے ہارمونز اور دیگر کیمیائی عوامل کے لئے زبردست منفی اثرات کا باعث بنتے ہیں، جو خون کے ذریعہ بچے کی جسمانی اور ذہنی تشکیل پر اثر انداز ہوتے ہیں، پیدائش کے وقت وزن کی کمی اور کمزوری کا اور اس کے مزاج میں مستقل چڑچڑے پن، بھوک، پیاس اور دوسری ضرورتوں میں بے صبری اور غصہ کا سبب بنتے ہیں اور اکثر زندگی بھر کی یہی عادت بن جاتی ہے، ہاضمے کی خرابی، قے کی شکایت اور جوانی میں آنتوں کے مختلف امراض بھی دوران حمل ہارمونز کی خرابیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں، اس لئے اسلامی نقطۂ نظر سے حالت حمل میں اچھے خیالات، نیک کام، نماز تلاوت اوراد و وظائف کا اہتمام ذہنی اطمینان اور قلبی آسودگی کے لئے مؤثر سمجھے گئے ہیں۔

پیدائش کے بعد بھی بچہ اپنے قریب جس وجود کو محسوس کرتا اور اپنی تمام ضرورتوں میں جس کا سب سے زیادہ محتاج ہوتا ہے وہ ماں ہی ہے، دودھ پلانے کا عمل جو بظاہر بچہ کی جسمانی ضرورت ہے مگر حقیقت میں ماں اپنی قلبی اور ذہنی کیفیت دودھ کے ساتھ بچہ میں منتقل کر رہی ہوتی ہے، جسمانی غذا کے اس نظام سے اس کی صحت اور مزاج پر مرتب ہونے والے اچھے اور برے اثرات کا مشاہدہ معمولی انسان بھی کرتا ہے، ماں بھی ان دنوں اپنے بچے کو تکلیف سے بچانے کے لئے حفظان صحت کے اصولوں کی ایسی پابند ہو جاتی ہے کہ بعض لذیذ اور پسندیدہ غذاؤں کو ان کے مزاجی نقصانات کی وجہ سے ترک کر دیتی ہے۔ حتی کہ آب وہوا، پانی کے استعمال میں بھی غایت درجہ احتیاط سے کام لیتی ہے۔

بچہ کی جسمانی صحت کیساتھ اگر اس کی روحانی اور اخلاقی صحت کا ایسا ہی خیال رکھا جائے تو بچہ کے

ساتھ خود والدین کے اخلاق و کردار میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوسکتی ہیں جس کو مذہبی اصطلاح میں ''تقوی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تعلیم کے تمام ذرائع، بچہ کی بنیادی صلاحیتوں کو ابھار تو سکتے ہیں، مگر ان میں وہ صلاحیتیں دراصل ماں اور باپ کی مشترک کوششوں اور گھر میں پائے جانے والے خوشگوار ماحول ہی میں تشکیل پاتی ہیں۔ گو اس چھوٹی سی عمر میں بچہ باضابطہ تعلیم کا اہل نہیں ہوتا مگر قدرت نے جو علم کے ذرائع بینائی اور شنوائی کی صورت میں دے رکھے ہیں ان سے لاشعوری طور پر سیکھتا اور سمجھتا رہتا ہے بسا اوقات ان حرکتوں اور الفاظ کو نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو نظر آتے ہیں یا اس کے کانوں میں پڑ جاتے ہیں۔ فطری طور پر بچہ ایسا کرنے پر مجبور ہوتا ہے کیونکہ اس عمر میں اس کی تعلیم کا نقل ہی ایک واسطہ ہوتا ہے، جسے علمی اصطلاح میں تقلید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لئے بچہ کے سامنے ایسے اقوال و اعمال کا اہتمام ضروری ہے جو اس کے لئے طے کئے گئے ہدف میں معاون ثابت ہوں۔

گھر اور خاندان ہی دراصل اولاد کے روشن یا تاریک مستقبل کا حقیقی سبب ہے۔ خاندانی اجتماعات اور گھریلو تقریبات جن میں بچے بڑوں کے ساتھ کچھ وقت گذارتے ہیں ان کی نشوونما اور تربیت میں غیر معمولی رول ادا کرتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کی پوری ذمہ داری اسکولوں اور مدرسوں پر ڈالنا ، جہاں وہ صرف اپنے ہم عمروں کے بیچ رہتا ہے درست نہیں، کیوں کہ غیر شعوری یا لایعنی سرگرمیوں میں مصروف اس جماعت سے بہت کم ایسے اقدار کا تبادلہ ہو پاتا ہے جو اس کی زندگی میں کوئی تعمیری جہت کے اضافہ کا سبب بن سکتے ہوں۔

اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بچہ کی پیدائشی فطرت اور حیوانی اور شیطانی جبلتوں کے درمیان اعتدال قائم کرنے میں گھر کے ماحول کو بڑا دخل ہے۔ گھر کے ماحول میں جن باتوں اور سرگرمیوں کو معمول کا درجہ مل جاتا ہے بچہ اس کی تکرار اور نقل کی کوشش میں لگ جاتا ہے، جہاں ذکر و تلاوت، نماز، دعا اور نیک کاموں کا رواج ہوتا ہے وہاں بچہ بھی اس کی نقل اتارتا ہوا پایا جاتا ہے اور جہاں ناچ گانا لڑائی جھگڑوں کو فروغ ہوتا ہے بچے تھرکتے اور لڑتے دکھائی دیتے ہیں، ایسا ماحول عام طور پر ان گھروں میں زیادہ نظر آتا ہے جو معاشرے کے ان کرداروں سے بے پناہ متاثر ہوتے ہیں جن کی معاشی اور مادی حیثیت توکشش کا باعث ہوتی ہے، لیکن ان کی زندگی انسانی اقدار اور اخلاقی معیار کی کسوٹی پر کسی زاویہ سے مثالی ثابت نہیں کی جاسکتی، سنیما، اور ٹی وی اور اشتہاری تختوں پر نظر آنے والے خوبصورت چہرے درحقیقت کاغذی پھول ہیں جو پروپیگنڈے کے زور پر مہکتے اور آنکھوں کو خیرہ کردیتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں ان کی شناخت محض بناوٹی

اداؤں تک محدود ہوتی ہے، جبکہ کردار بے ساختہ اور مسلسل عملی مظاہر کا نام ہے۔

گھر کے بعد بچہ مدرسہ اور اسکول کے مرحلہ سے گذرتا ہے، رسمی تعلیم کا یہ دور انتہائی حساس ہوتا ہے، اسکول کا محل وقوع، اس کے آس پاس کی موافق فضا، گھر سے اسکول کے سفر کے درمیان پائے جانے والے مناظر، ہم سبق دوستوں کا کردار، اسکول کا ماحول، نصاب و کتاب، درس گاہ کی سرگرمیاں، اساتذہ اور اسکولی عملہ، ان سب کے مجموعی حالات سے بچہ متاثر ہوتا اور سیکھتا ہے۔

عام طور پر والدین اس عمر میں اولاد کو اسکول بھیجنا ضروری سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک تعلیم کا پورا مطلب اسکول یا مدرسہ ہے۔ نظام تعلیم کی پیچیدہ باریکیوں اور تصور تعلیم کی دقیق بحثوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا، حالانکہ خود مغرب جس کی تعلیمی، سائنسی اور تمدنی ترقیوں سے ہم متاثر ہیں اور جس کے نظام تعلیم کا سکہ پوری دنیا میں رائج ہے، اس کے یہاں مذکورہ عوامل کی تاثیر کا شعور اس حد تک موجود ہے کہ انہوں نے اپنے یہاں دو قسم کے نظام تعلیم قائم کئے ہوئے ہیں۔

ایک نظام تو وہ ہے جہاں کے طلبہ ملک وقوم کے نمائندہ شعبوں میں قائدانہ مثالی کردار ادا کرتے ہیں، ان اداروں کو اندر اور باہر سے ان تمام عوامل سے پاک رکھا جاتا ہے جو طالب علم کی تعلیمی اور اخلاقی سرگرمیوں پر برا اثر ڈال سکتے ہیں، وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کا اختلاط ممنوع ہے، ان اداروں کے آس پاس تو کیا اچھی خاصی دوری پر کوئی سنیما ہال، شراب خانہ یا جنسی تحریک کا کوئی تجارتی اشتہار تک نظر نہیں آسکتا، قابل عمل اور طلبہ کی استعداد کے مطابق نصاب تعلیم مقرر کیا جاتا ہے، طلبہ کی تعلیمی یکسوئی کو نقصان پہنچانے والی ہر سرگرمی سے پرہیز کیا جاتا ہے، یہاں سے تعلیم پانے والے طلبہ ملک کے کلیدی شعبوں سے منسلک ہوکر ملک وقوم کی خدمت انجام دیتے ہیں۔

دوسرا نظام تعلیم وہ ہے جس میں ملک کے اکثر بچے تعلیم پاتے ہیں، جہاں تعلیم کے ساتھ بچہ کی نفسانی اور حیوانی دلچسپیوں کے دسیوں اسباب قصداً پھیلائے جاتے ہیں، جن کی موجودگی تعلیمی عمل کے پابند ماحول کے مقابلے میں بچہ کے لئے زیادہ لذیذ اور پرلطف ہوتی ہے، لڑکے لڑکیوں کا اختلاط، ہیجان انگیز یونیفارم، کثرت مضامین، امتحانات کا غیر ضروری سلسلہ، کھیل وتفریح کا غیر متوازن نظام، اساتذہ کی واجبی صلاحیتیں، جنسی محرکات پر مبنی وسائل تعلیم، آزاد ماحول، اخلاقی بے راہروی سے مجرمانہ چشم پوشی، اسکول کے قریب سنیما ہال، کلب، بار اور ہوٹلوں کا وجود ان سب غیر تعلیمی اور غیر اخلاقی وسائل کی موجودگی میں علم واخلاق کی امید ہی نہیں کی جاسکتی۔

اولاد کو کامیابی کے اگلے مرحلہ تک پہنچانے کا بہت ہی اہم کام اسکول اور مدرسہ کے ذمہ ہے، اس لئے اولاد کو اسکول یا مدرسہ میں داخل کرادینے سے والدین کی ذمّے داری ادا نہیں ہوجاتی بلکہ اس اسکول یا مدرسہ کے انتخاب کے وقت وہاں کے سنجیدہ اور پروقار ماحول پر اطمینان بھی ضروری ہے، نصاب وکتاب وسائل واہداف، آس پاس کے ماحول کا جائزہ، اساتذہ اور طلبہ کے علمی، سماجی اور تہذیبی پس منظر سے واقفیت بھی لازمی ہے۔

ماں کا پیٹ اولاد کی جسمانی ساخت اور اعضاء وجوارح کی تشکیل کا مقام ہے ایسے ہی عقل وشعور اور فکر وفن کے پروان چڑھنے اور خاندانی اور تہذیبی قدروں کی حفاظت وترقی کے لئے علمی اور استدلالی قوت حاصل کرنے کی جگہ مدرسہ اور اسکول ہے، جو مادر علمی سے جانا جاتا ہے، مگر ہم اپنی اولاد کی تعلیم کے لئے جن مدارس کے انتخاب پر مجبور ہیں اس کی تصویر اوپر ذکر کئے گئے خاکہ سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔

اولاد کی اخلاقی اور روحانی بربادی کے ان مراکز پر کلی انحصار کے ساتھ والدین اپنے خوابوں کو حقیقت کے جامہ میں کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ ایسی تعلیم گاہوں سے تیار ہونے والی نسل تاحیات احساس محرومیت کے دلدل میں پھنسی رہتی ہے، ملک وقوم کی تعمیر وترقی میں قابل قدر حصہ لینے سے قاصر ہوتی ہے۔ غیر حقیقی تمناؤں اور رومانی آرزؤں کی اسیر ہوتی ہے، تکمیل خواہشات کا جنون ان کو جہاں چاہتا ہے کھینچ لے جاتا ہے اور جو چاہتا ہے ہوس کی ہڈی دکھا کر ان کو اپنا غلام بنالیتا ہے۔

گھر اور اسکول کے علاوہ اولاد کو صاف ستھرا ماحول فراہم کرنا بھی اس کی مثالی تربیت کا حصہ ہے۔ محلہ، گاؤں یا شہر جس میں وہ اپنی کئی ضرورتوں کے لئے وقت گزارتا ہے وہاں کے عمومی ماحول سے بھی بچہ بہت کچھ سیکھتا ہے ۔ والدین کو گھر کے پابند اور صالح ماحول پر اعتماد کر کے اس فریب میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کہ باہر کے فساد اور شہر کی طرز زندگی اولاد کے اخلاق وکردار کو متاثر نہیں کرسکتی، نکڑ اور چوراہوں پر، محلہ اور بستی میں نوجوانوں کی ہر سرگرمی کا مشاہدہ کرتے وقت والدین اپنی اولاد کو ان برائیوں سے صرف اس لئے بری مان لیتے ہیں کہ وہ برائی ان کا بچہ ان کے سامنے نہیں کرتا، حالانکہ بچہ اپنے ہم عمر بچوں میں رائج ہونے والے اچھے یا برے چلن سے متاثر ہوتا ہے۔ صرف گھر کا دروازہ بند کرلینے سے ہمارا گھر ان برائیوں سے محفوظ نہیں ہوجاتا، بچہ کی پراسرار اور تجسس پسند فطرت برابر اس سے واقف ہوتی رہتی ہے،

اس لئے جو والدین ماحول کی اصلاح اور تحفظ میں عملا حصہ لیتے ہیں وہ اپنی اولاد کو کسی خوش فہمی کی وجہ سے ماحول کے حوالے کردینے کی غلطی نہیں کرسکتے اور اس حوالہ سے کسی لاپرواہی کے شکار نہیں ہوتے وہ

دونوں جہتوں پر یکساں بیداری کا ثبوت دیتے ہیں۔ والدین کو اپنی اولاد کے روشن مستقبل اور مثالی انسان بنانے کے خواب کی تکمیل کے لئے ماحول کی اصلاح اور اس کے لئے تعمیری خطوط پر ہونے والی کوششوں میں سرگرم حصہ لینا بھی ضروری ہے تاکہ ماحول میں بدلتی اخلاقی قدروں کا بروقت ادراک کرسکیں اور اپنے بچوں کو غلط راہ پر پڑ جانے سے بہروقت بچا سکیں۔

☆☆☆